بچوں کے لیے دلچسپ، انوکھی، سبق آموز اور منفرد کہانیاں
5
دلچسپ کہانیاں
2
ماسٹر پبلشرز
المعراج سنٹر
22-اُردو بازار لاہور

# بابا کی تلوار

**کرم دین** ایک لکڑہارا تھا۔ وہ دن بھر درختوں سے سوکھی ٹہنیاں کاٹ کاٹ کر جمع کرتا اور جب اس قدر جمع ہو جاتیں، جس قدر وہ اٹھا سکتا تو وہ لکڑیوں کو اپنے ساتھ لائی گئی رسیوں سے باندھتا اور کمر پر لاد کر گھر لے جاتا۔ یہی اس کا پیشہ تھا۔ جس قدر لکڑیاں گھر میں جلانے کے کام آتیں، جلائی جاتیں اور باقی لکڑیاں گاؤں والوں کو مناسب داموں بیچ دیتا تھا۔ لکڑیوں کی اس آمدنی سے اس کی گزر بسر اچھی طرح ہو رہی تھی۔ کرم دین کی یہ عادت بہت اچھی تھی کہ وہ کبھی بھی ہرے بھرے اور سرسبز و شاداب درختوں کو نہیں کاٹتا تھا بلکہ جو پودے تنا اور درخت بننے سے پہلے جل جاتے تھے یا پانی نہ ملنے کی وجہ سے سوکھ جاتے تھے یا پھر خزاں رسیدہ ہو جاتے تھے۔ تو وہ انہی کو کاٹ کر لاتا تھا۔ اس کے علاوہ پھل دار، ثمر بار اور سایہ دار درخت کو وہ ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ ایسے درختوں کو وہ نہ خود نقصان پہنچاتا تھا اور نہ کسی کو نقصان پہنچانے دیتا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ وہ لکڑیاں کاٹنے کے لئے روانہ ہوا۔ آس پاس اور گاؤں کے اطراف سے تو وہ سوکھی لکڑیاں کاٹ چکا تھا۔ کل بھی اسے گاؤں سے کافی دور جانا پڑا تھا۔ تب کہیں جا کر اسے اپنی روزی نظر آئی تھی۔ اس کام میں اسے پہلے تلاش کرنا پڑتی تھی۔ پھر محنت سے کام کرنا پڑتا تھا گویا مطلب کی لکڑیوں کی تلاش بھی ایک مشکل کام تھا۔ ورنہ دوسرے مطلب پرست لکڑہارے اپنا مطلب نکالنے کے لئے اور اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے ہرے بھرے اور سایہ دار درختوں کو بھی کاٹنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ بہت سے لکڑہاروں نے تو وہ درخت بھی کاٹ ڈالے تھے۔ جن کے سائے میں تھکے ہارے مسافر دو گھڑی چین کا سانس لیتے تھے۔ اس مطلب پرستی اور خود غرضی کی وجہ سے

انہیں خود بھی دھوپ میں چلنا پڑتا تھا۔ کیونکہ اب دور دور تک شجر سایہ دار کا نام ونشان نہ رہا تھا۔

کرم دین کو کافی پیدل چلنا پڑا لیکن اس کے مطلب کی لکڑیاں نہیں ملیں۔ ایک راہ گیر سے کرم دین کی ملاقات ہوئی۔ راہ گیر کے چہرے پر زمانے کی گردشوں نے اچھے نقوش بنائے ہوئے تھے۔ اس نے کرم دین کو اس ویرانے میں دیکھا تو پوچھا۔ ''کیا تم لکڑ ہارے ہو؟''

''ہاں میں لکڑیوں کی تلاش میں اس طرف آ نکلا ہوں۔ لیکن مجھے سوکھی لکڑیاں کہیں نظر نہیں آ رہی ہیں''۔ کرم دین نے اپنی مجبوری اس پر ظاہر کر دی۔ اس کی ضرورت سن کر راہ گیر بولا۔ ''غور سے سنو! وہ سامنے ایک پہاڑ ہے اس پہاڑ کے اس پار دامن میں ایک قلعہ ہے۔ اس قلعے سے آگے آبشار بہہ رہا ہے۔ آبشار کا پانی قدرتی طور پر زمین میں درختوں کی جڑوں کو ملتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے بے شمار درخت خود بخود اگ آئے ہیں اور تناور بن گئے ہیں۔ تم ہر روز اس جگہ چلے جایا کرو۔ وہاں کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہیں ہے۔ جس قدر چاہو لکڑیاں کاٹو اور روزی کماؤ''۔

راہ گیر نے کرم دین کو مخصوص جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ کرم دین کو اس کا مخلص مشورہ تو پسند آیا لیکن کرم دین کی عادت کو وہ نہیں جانتا تھا۔ اس لئے کرم دین نے اجنبی سے کہا۔ ''تم کہتے ہو وہاں ہر وقت ہریالی بہت ہے۔ درخت پھولے پھلے ہیں کیونکہ قدرتی طور پر ان کو آبشار سے پانی ملتا رہتا ہے۔ لیکن اجنبی میں تو سوکھ جانے والے درختوں کی لکڑیاں کاٹنے کے بعد کام میں لاتا ہوں۔ مجھے ہرے بھرے درختوں سے کوئی سروکار نہیں ہے''۔

یہ بات سن کر اجنبی کہنے لگا۔ ''بابا! ہرے بھرے درخت تو اس وقت مفید ہیں جو وہ آبادی میں ہوں تاکہ انسان ان درختوں سے فائدہ حاصل کر سکے۔ جہاں میں تمہیں



بھیج رہا ہوں وہاں کوئی آبادی نہیں بلکہ کئی صدیوں سے یہ جگہ ویران اور غیر آباد پڑی ہے کوئی انسان یہاں نہیں رہتا۔ ادھر تو کوئی جانور بھی نہیں آتا ہے۔ کیونکہ انہیں شکار کرنے کے لئے وہاں کوئی آدمی نہیں ملتا جس کا شکار کر کے وہ اپنا پیٹ بھر سکیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ راہ گیر چلنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔

کرم دین کو اس کی کچھ باتیں سمجھ میں آ چکی تھیں۔ کرم دین اسی طرف چل دیا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ واقعی جس جگہ آدم زاد نہیں ہوں اس جگہ درختوں کا ہونا بے سود ہے۔ اس لئے ایسے درختوں کو کاٹ کر ایندھن بنایا جا سکتا ہے۔ ابھی کرم دین دو سو یا تین فرلانگ چلا ہو گا کہ اسے پہاڑ کی چوٹی پر سے ایک شخص اترتا نظر آیا۔ اس شخص کا حلیہ دیندار لوگوں جیسا تھا۔ وہ باریش تھا۔ سر پر سفید عمامہ سجائے ہوئے۔ ہاتھ میں تسبیح کے دانے گردش کر رہے تھے۔ مونچھیں بہت پست تھیں۔ چہرے پر نور چمک رہا تھا۔ اس شخص نے کرم دین کے قریب آتے ہی دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ''بابا اس طرف جانے کا ارادہ ترک کر دو جس طرف تم جا رہے ہو؟'' کرم دین نے اپنے دل کی بات اس بزرگ کے لبوں پر سنی تو بہت حیران ہوا کہ بزرگ کوئی پہنچی ہوئی شخصیت تھی کہ ان کو کشف کے ذریعے کرم دین کے دل کی بات پتہ چل گئی۔ پھر بھی کرم دین نے پوچھ ہی لیا۔

''بزرگ آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں اس جانب جا رہا ہوں؟''

''بابا تمہارا رخ اس جانب ہے۔ تمہارے قدم اس سمت کی طرف اٹھ رہے ہیں بھلا اس میں تجسس کی کیا بات ہے میں نے تمہیں چلتا دیکھ کر اندازہ لگا کر کہہ دیا''۔ بزرگ نے اپنی قابلیت کی چھپاتے ہوئے بتایا۔

''لیکن میں اس طرف کیوں نہ جاؤں؟ اس طرف میری کشادہ روزی کے در ہیں!'' کرم دین نے وضاحت کی۔ اس کی وضاحت میں اصرار پوشیدہ تھا۔

''بابا اگر کسی نے تمہیں یہ بات بتائی ہے کہ اس جگہ تمہاری کشادہ روزی کے

آثار ہیں تو یہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے کیونکہ کسی اجنبی پر بھروسہ کرنا اچھی بات نہیں ہوتی اس جگہ موت ہے۔ جو شخص بھی اُس پہاڑ کے دامن میں اتر کر قلعے کو پار کرتا ہے۔ قلعے میں رہائشی باز اسے دیکھتے ہی حملہ آور ہوتے ہیں اور وہ آدمی کو دیکھتے ہی دیکھتے چٹ کر جاتے ہیں کیونکہ گوشت ان کی مرغوب غذا ہے اور وہ بھی آدم کا گوشت"۔

"جیسے آپ کی مرضی"۔ بزرگ نے کرم دین کی بات کاٹتے ہوئے اپنی راہ لی اور چند ساعتوں میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کرم دین نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ وہ اسی پہاڑ پر چڑھ گیا جس پہاڑ پر سے بزرگ اتر کر آئے تھے۔ واقعی وہاں ایک قلعہ تھا جو دونوں ملنے والوں اجنبیوں نے بتایا تھا۔ اس سے ذرا آگے ایک آبشار بھی بہتا دکھائی دیا جس کا پانی دور سے ہی بڑا اشفاف نظر آرہا تھا۔ آبشار کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں تھیں۔ درخت بہت گھنے اور بڑے بڑے تھے جنہیں دیکھ کر کرم دین کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نظر کچھ پرندوں پر بھی پڑی جو باز ہی تھے وہ آبشار کے قریب منڈلا رہے تھے۔

آدم خور باز کے بارے میں بزرگ نے کرم دین کو بتا دیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے کرم دین پر خوف چھایا لیکن جلد ہی رفو ہو گیا۔ وہ خطروں کو بھول کر درختوں کی جانب قدم بڑھانے لگا۔ بہت جلد کرم دین اس قلعے تک پہنچ گیا جو بہت ہی پرانا تھا اور بے حد بوسیدہ ہو چکا تھا۔ اس کے دروازے پر بڑا سا تالا پڑا تھا جو بے حد زنگ آلود ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی اس قلعے میں برسوں سے داخل نہیں ہوا تھا۔ کرم دین نے اس قلعے کی تاریخ میں الجھ کر وقت ضائع کرنا نہیں چاہا۔ چنانچہ وہ جیسے ہی آگے بڑھا ایک باز اس کے سر کے اوپر نہ صرف اڑنے لگا بلکہ زور زور سے شور مچانے لگا۔ اس کی آواز میں عجیب خوشی کا اظہار تھا۔ چند ساعتیں بھی نہ گزری تھیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے اسی بوسیدہ قلعے میں سے غول در غول باز اڑ اڑ کر آنے لگے اور پلک جھپکنے میں اس پر حملہ آور ہو گئے۔ کرم دین



نے آنکھوں کے سامنے موت کا رقص دیکھا تو اسے بزرگ کی نصیحت اور اجنبی کا دھوکہ رہ رہ کر یاد آنے لگا۔ کرم دین کو اپنی ضد اور لالچ پر بہت افسوس ہوا لیکن پچھتاوے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"۔ سینکڑوں بازوں نے چشم زدن میں لکڑ ہارے کرم دین کی بوٹی بوٹی الگ کی اور چٹ کر گئے اور یوں لالچ اور ضد نے کرم دین کو جان سے ہاتھ دھونے پر مجبور کر دیا۔

آدم خور بازوں نے کرم دین کی ایک ایک ہڈی کا گوشت اس طرح نوچ نوچ کر کھایا کہ بالکل صاف ہڈیاں نظر آنے لگیں جیسے کوئی کنجوس قصاب ہڈی کی صفائی کرتے وقت اس پر سے گوشت کا ایک ایک ذرہ اتار لیتا ہے۔ بازوں نے آدم خوری کے بعد آبشار سے پانی پیا اور رفتہ رفتہ غول در غول اسی قلعہ میں چلے گئے۔

کرم دین اکثر شام کے وقت ہی گھر پہنچتا تھا اگر زیادہ دیر ہوتی تھی تو مغرب کے بعد لازمی گھر پہنچ جاتا تھا۔ لیکن آج تو عشاء کی نماز بھی ہو گئی تھی۔ گھر والوں کو اس کی کوئی خبر نہ ملی تو سب فکر مند ہو گئے۔ رات بھر اس کا انتظار کرتے رہے اور صبح ہونے کی آس میں ٹہل ٹہل کر اضطرابی کیفیت میں رات گزار دی۔ صبح ہوتے ہی کرم دین کی گمشدگی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ سب نے اپنی اپنی کوششیں کر دیکھیں لیکن کسی کی کوشش اور محنت بار آور ثابت نہ ہوئی۔ کوئی خبر نہ مل سکی۔ گھر والے رو دھو کر خاموش ہو گئے۔ لیکن ساتھ والے گاؤں میں چودھری کے یہاں ملازمت کرنے والے کرم دین کے بیٹے کو اس کی خبر پہنچا دی گئی تھی۔

کرم دین کا بیٹا، نظام الدین بہت تندرست و توانا اور چاک و چوبند تھا۔ مضبوط اعصاب کا مالک۔ کسرتی بدن رکھنے والا۔ ذہین، عقلمند اور زمانہ شناس شخص تھا۔ بہادری اور ہوشیاری اس کی اضافی خوبیاں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ گاؤں کے چودھری نے اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا تھا۔ جس سے اسے بہت فائدہ ہو رہا تھا۔ نظام الدین کو جیسے ہی

خبر ملی کہ اسکے والد غائب ہو گئے ہیں وہ نازک صورت حال چودھری کو سمجھا کر گھر آنے کی اجازت کے ساتھ ساتھ کچھ دن کی چھٹیاں لے آیا۔ گھر آکر اس نے بہت لوگوں سے سوالات کئے اور والد کے بارے میں پوچھ گچھ کی لیکن کسی سے کوئی آگہی حاصل نہ ہوئی۔ آخر کار وہ بذات خود اپنے باپ کی تلاش میں نکل آیا۔ نظام الدین ہمیشہ ایک شکاری کا بھیس بدل کر رہتا تھا۔ اس نے اپنی شخصیت ہی کچھ ایسی بنا رکھی تھی کہ لوگ اسے دیکھ کر شکاری سمجھتے تھے۔ اس کی کمر پر ایک جھولا لٹک رہا ہوتا تھا۔ جس میں وہ تیر کمان، دیگر اوزار اور ضرورت کا سامان رکھتا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نظام الدین نے ایک کتا بھی پال رکھا تھا۔ جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا اور قدم قدم پر اس کی مدد بھی کرتا تھا۔ اس کتے کا اس نے نام ٹومی رکھا ہوا تھا۔ ٹومی اپنے مالک کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کی اور اس کے سامان کی خوب حفاظت کرتا تھا۔ ٹومی بہت وفادار جانور تھا۔ یہاں تک کہ اپنے مالک کے لئے اپنی جان پر بھی کھیل جاتا تھا۔ نظام الدین کو ٹومی کی یہی باتیں بہت پسند تھیں۔ پھر ایک اور وجہ بھی تھی جس کی وجہ سے ٹومی ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ نظام الدین کو ایک بڑے عامل بابا نے بتایا تھا کہ جانوروں کو خصوصاً کتے کو جن، بھوت اور بدروحیں نظر آجاتے ہیں۔ اس لئے کئی بار ٹومی نے بھونک بھونک کر بدروحوں کی خبر دی تھی۔ جس سے بچنے کی نظام الدین نے حفاظتی تدابیر اختیار کر لی تھی اور یوں وہ اکثر خطرات سے دور رہا تھا۔

اس بار بھی نظام الدین نے جہاں ضروریات زندگی، خورد و نوش کا سامان ساتھ لیا وہاں اوزار، ہتھیار اور دیگر ساز و سامان کے ساتھ ساتھ ٹومی کو بھی تیار کیا اور اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ اس تیاری میں نظام الدین کا حلیہ بالکل شکاریوں جیسا تھا۔ اس نے پاؤں میں لانگ بوٹ پہنے ہوئے تھے اور ان کو اچھی طرح تسموں سے کس لیا تھا۔ ان بوٹوں سے وہ پتھریلے اور خار دار راستوں پر با آسانی چل سکتا تھا۔ اس کا لباس بھی



شکاریوں جیسا تھا۔ جس میں اسے آسانی رہتی تھی۔ سب سے قابل ذکر چیز اس کے پاس وہ تلوار تھی جو اسے اس عامل بابا نے عطا کی تھی۔ اس تلوار میں نجانے کیا خوبی کی بات تھی۔ یہ تلوار نہ تو کبھی کند ہوئی تھی اور نہ کبھی زنگ آلود۔ ٹوٹنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دیکھنے میں یہ تلوار بالکل عام سی تھی لیکن عامل بابا نے نجانے اس پر کیا پڑھ کر پھونکا تھا کہ اس کی کاٹ، بہت تیز ہو گئی تھی۔ ایک ہی وار میں دشمن کو نیست و نابود کر دیتی تھی۔ دشمن چاہے انسان ہو یا جانور۔ نظام الدین کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا اور ہر وقت دل سے لگائے رہتا تھا۔

وہ مشرق کی سمت اپنے باپ کی تلاش میں چل پڑا۔ راستے میں گاؤں والوں سے دریافت کرتا رہا۔ ایک شخص نے بتایا کہ اس کے گاؤں کے اطراف میں لکڑیاں اتنی نہیں رہی تھیں جن کو کاٹ کر وہ اپنی روزی کماتا اس لئے اس نے ایک دن دور کہیں جانے کا ذکر کیا تھا۔ اس لئے نظام الدین اسی اشارے کے تحت گاؤں سے دور ہوتا گیا۔ اس نے اپنا سفر مسلسل جاری رکھا اور وہ ان راستوں پر چلتا رہا جن پر اسے امید تھی کہ یہ راستے جنگلات کی طرف جاتے ہوں گے کیونکہ ایک لکڑہارا پتھریلی جگہ پر تو جانے سے رہا۔ وہ یقیناً کسی ایسی جگہ ہی جائے گا جہاں اسے لکڑیاں ملنے کی امید ہو گی۔ وہ آبادی کے آخری سرے پر پہنچ چکا تھا۔ ایک عقل مند شخص نے اسے منع کیا کہ وہ مزید آگے نہ جائے کیونکہ آگے کوسوں کے فاصلہ گزر جانے کے باوجود بھی آبادی نہیں ہے۔ اس لئے لوگ اس طرف نہیں جاتے۔ لیکن نظام الدین کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اسی طرف کچھ ثبوت ملنے کی امید ہے وہ چلتا رہا۔

اس نے بہت دور سے ایک عجیب سے اجنبی شخص کو آتے دیکھا۔ ابھی وہ قریب بھی نہیں آیا تھا کہ ٹومی نے بھونکنا شروع کر دیا۔ ٹومی کبھی بھی بے وجہ بھونکتا نہیں تھا۔ نظام الدین سمجھ گیا کہ سامنے سے آنے والا شخص انسان نہیں ہے۔ کوئی بدروح، جن یا

بھوت وغیرہ ہے۔ نظام الدین بہت بہادر شخص تھا۔ اس نے ٹومی کو بیٹھ جانے کا کہا اور اس پر چادر ڈال دی۔ جب تک ٹومی بھونکتا رہا تھا تب تک وہ اجنبی اس جگہ ساکت ہو گیا تھا۔ نظام الدین جب کتے پر چادر ڈال دی تب وہ اجنبی آگے بڑھا اور بولا۔ ”اے نوجوان! تم شکاری ہو، جاؤ تمہیں اس قلعے کے پار جنگل میں بہت شکار ملے گا۔ اپنی پسند کے ہرن مارنا اور وہیں جنگل کے درختوں کی لکڑیاں جلانا اور ہرن کو بھون کر کھانا۔ خوب صحت بنے گی“۔ نظام الدین نے اس کی بات سکون سے سنی اور سوال کیا۔ ”کیا مجھ سے پہلے بھی کوئی شکاری ادھر گیا ہے جس کا حلیہ مجھ جیسا ہو؟“

”نہیں کوئی شکاری تو اسطرف نہیں گیا لیکن ایک شخص دو دن پہلے ادھر گیا تھا۔“

”ہاں! ہاں! خاموش کیوں ہو گئے۔ کون شخص تھا وہ اور کس کام سے اس طرف گیا تھا؟“

نظام الدین کو اپنے باپ کا کچھ سراغ ملا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بہت بے چین ہو کر اجنبی سے دریافت کیا تھا۔ اجنبی سمجھ گیا کہ اس شکاری کو اسی بوڑھے لکڑہارے کی تلاش ہے۔ اس لئے اجنبی نے سوچا کیوں نہ اس نوجوان کو اس طرف بھیجنے کے لئے اس بوڑھے کے متعلق بتایا جائے اور جواز پیدا کیا جائے۔

”ایک بوڑھا لکڑہارا تھا جو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر روزی کمانے کے چکر میں اس طرف گیا تھا لیکن واپس نہیں آیا“۔ اجنبی نے یہ بات بتا کر نظام الدین کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ شکاری کے تاثرات دیکھنا چاہتا تھا اور یہ ہوا بھی۔ نظام الدین کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اسے دال میں کچھ کالا نظر آیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں اسی شخص نے تو میرے باپ کو راستہ بھٹکا کر قید کیا ہو یا نقصان پہنچایا ہو اسی لئے نظام الدین نے اسے کرید نے کے لئے مزید پوچھا۔

”تمہیں کیسے معلوم کہ وہ واپس نہیں آیا؟“ نظام الدین نے پوچھا۔



”کیونکہ میں نے اسے جاتے ہوئے تو دیکھا تھا لیکن واپس آتے ہوئے نہیں دیکھا، اس لئے کہہ رہا ہوں“۔ اجنبی نے بات بناتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں اسی کی تلاش میں ادھر آیا ہوں۔ کیونکہ وہ میرا باپ ہے وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچا۔ اسی لئے میں اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا ہوں“۔ یہ باتیں سن کر اجنبی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ پر مسرت لہجے میں گویا ہوا۔

”تمہیں اس طرف جلدی جانا چاہیے کیونکہ وہ اسی طرف گیا تھا، کہیں بازوں نے اسے کھا تو نہیں لیا؟“ اجنبی کے منہ سے ایک اور بات سنائی دی تو نظام الدین کا تجسس مزید بڑھ گیا۔

”کیا کہا، آدم کو باز کھا لیتے ہیں!“ نظام الدین نے انتہائی حیرت سے سوال کیا۔

”ہاں شکاری اس قلعے میں بازوں نے اپنا مسکن بنا رکھا ہے۔ وہ آدم خور باز ہیں۔ آدم زاد کو دیکھتے ہی دیکھتے چٹ کر جاتے ہیں“۔ اجنبی نے اسے اشتعال دلانے کے لئے حقیقت احوال بیان کر دیئے۔

”لیکن تم اتنے عرصے سے یہاں رہائش پذیر ہو، تمہیں ان بازوں نے کیوں نہیں کھایا؟“ نظام الدین کے اس سوال نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا۔ وہ گنگ سا ہو گیا۔ نظام الدین موقع کی نزاکت کو سمجھ چکا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ ”اجنبی غور سے سنو! بازوں نے تمہیں اس لئے نہیں کھایا کہ تم آدم زاد نہیں ہو۔ تم ایک بد روح ہو۔“

یہ کہتے ہوئے نظام الدین نے اپنے ٹومی کو آزاد کر دیا۔ چادر ہٹتے ہی ٹومی کی نظر جیسے ہی اس اجنبی پر پڑی اس نے بے تحاشا بھونکنا شروع کر دیا۔ نظام الدین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اس کتے کا بھونکنا بے سبب نہیں ہے۔ یہ تم جیسے جن، بھوت پریت اور بدروحوں کو ہی دیکھ کر بھونکتا ہے اور میں پہچان لیتا ہوں کہ میرے سامنے آدم زاد ہے یا کوئی

شے۔ جیسے میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم نے ہی میرے والد کو اس طرف بھٹکا کر بھیج دیا ہوگا۔ اور پھر آدم خور بازوں سے ان کا صفایا کروا دیا ہوگا۔ ٹومی پکڑ لو اس بدروح کو!'' نظام الدین نے ٹومی کو اشارہ کرتے ہوئے خود بھی تلوار نکال کر اس پر وار کیا۔ وار بہت کاری تھا۔ اس ب دروح کو گھائل کرنے کے لئے کافی تھا لیکن وہ بدروح اب نظام الدین کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ بس ٹومی بھونکے جا رہا تھا۔ پھر وہ بھی رفتہ رفتہ خاموش ہو گیا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ بدروح اب اس جگہ موجود نہیں ہے۔

نظام الدین کتے کو ساتھ لے کر آگے بڑھا۔ پہلے اس نے پہاڑ پر چڑھ کر چاروں طرف دیکھا اور پھر ہوشیاری سے اس نے آدم خور بازوں سے بچنے کا ذہن میں ایک مکمل ارادہ بنا لیا۔ پہلے تو وہ قریبی گاؤں میں واپس چلا گیا۔ وہاں سے اس نے ایک گدھا، اونٹ، گائے، بکری اور بھینس کو منہ مانگے دام دے کر خریدا۔ پھر ایک عامل کی تلاش میں نکل گیا۔ اس نے الن بابا کا نام سن رکھا تھا۔ الن بابا کے چرچے دور دور تک تھے۔ وہ جادوگر نہیں تھا اور نہ ہی جادو ٹونے کے چکر میں پڑتا تھا۔ وہ تو کلام الٰہی کی مدد سے ہر کام کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے شفا دی تھی اور اس کے کام میں برکت۔ وہ دھوکہ دہی سے کام نہیں لیتا تھا۔ اپنی جان پر کھیل کر اوروں کی مدد کرنا اس کا شیوہ تھا۔ نظام الدین کو دیکھتے ہی الن بابا نے پوچھا۔

''کیا بات ہے بیٹا۔ میری ضرورت کیوں محسوس کرتے ہو۔''

''بابا اس قلعے میں فقط باز نہیں ہیں۔ میرا مطلب ہے آدم خور باز نہیں ہیں۔ اس قلعے میں بدروحوں نے اپنا مسکن بنا رکھا ہے جو بازوں کی شکل میں آدم زاد اور جانوروں پر حملہ آور ہو کر اس کا خون پی جاتی ہیں اور بعد ازاں اصلی باز ان لاشوں کا گوشت کھا لیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مشہور یہی ہو گیا ہے کہ اس قلعے میں آدم خور باز رہتے ہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میرے کتے نے بھی بدروح کو پہچان لیا ہے''۔ نظام الدین نے



ایک ہی سانس میں الن بابا کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ کیونکہ وہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''میں سمجھ گیا بیٹا! تمہارے ذہن میں کیا ہے مجھے بتاؤ!'' الن بابا نے کھل کر بات کرنے کی دعوت دی۔

''بابا! میں چاہتا ہوں کہ تم ان بدروحوں کا مقابلہ کر کے ان کو بھسم کر دو اور میں ان بازوں سے اچھی طرح نبٹ لوں گا''۔

''ٹھیک ہے بیٹا! مجھے ایک گھنٹے کی مہلت دے دو۔ پھر میں تیاری کر کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں''۔ یوں الن بابا تیاری کرنے لگے اور نظام الدین نے کچھ اور ضروریات کا سامان ساتھ لے لیا۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ دونوں اس قلعے کی جانب چل دیئے۔

دونوں جانوروں پر سوار ہو کر بہت جلد قلعے کے سامنے والے پہاڑ پر پہنچ چکے تھے۔ نظام الدین نے سب سے پہلے اپنے منصوبے کے مطابق بکری کے جسم پر نجانے کیا ملا۔ جب اسے اپنے کام کے مکمل اور موثر ہونے کا یقین ہو گیا تو اس نے بکری کو پہاڑ سے نیچے ہانک دیا اور اس جانب جہاں قلعے سے آگے آبشار تھا۔ بکری نے ہریالی دیکھی تو وہ اس جانب دوڑ گئی۔ ابھی اس نے گھاس پر دو چار منہ ہی مارے تھے کہ ایک باز اس پر منڈلانے لگا اور شور مچانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک غول بازوں کا نمودار ہوا اور بکری کا جسم نوچنے لگا۔ الن بابا کو ترس آیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں نظام الدین سے کہا کہ تمہیں ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔ بکری بھی جاندار شے ہے۔ اسے بھی تکلیف پہنچی ہے۔ نظام الدین نے بھی آنکھوں میں جواب دیا۔ بابا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے بکری کے جسم پر زہر اچھی طرح لگا دیا ہے جو باز بکری کے زہر آلود گوشت کی ایک بوٹی بھی کھا لے گا تو وہ اسی وقت مر جائے گا۔ اور الن بابا نے دیکھا کہ واقعی باز رفتہ رفتہ

گرنے لگے اور تڑپ تڑپ کر مرنے لگے۔ اس کے بعد نظام الدین نے گائے کو زہر آلودہ کر کے اس جانب بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔

بازوں نے اس پر بھی حملہ کیا اور غول در غول اس کے گوشت کو کھاتے اور چند قدم کے فاصلے پر گر جاتے۔ بابا یہ دیکھ کر حیران تھے کہ باز ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اس بار نظام الدین نے بھینس کو اور پھر اس کے بعد اونٹ کو ایثار کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اونٹ کا گوشت ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ باز ختم ہو گئے۔ قلعے کے اندر سے غول در غول سینکڑوں باز آئے لیکن زندہ واپس نہ جا سکے۔ ان جانوروں پر اب بھی بہت سے باز منڈلا رہے تھے لیکن وہ ان کا گوشت کھانے سے قاصر تھے۔ نظام الدین سمجھ گیا کہ اب یہ باز نہیں رہے بلکہ بدروحیں بچی ہیں جو بھینس اور اونٹ کا خون تو پی گئی ہیں لیکن ان کا گوشت نہیں کھا سکتیں۔

”بابا! اب آپ کا کام شروع ہوتا ہے۔ ان بدروحوں کا علاج آپ کے پاس ہے۔ میں نے ان بے زبان جانوروں کو اس لئے ایثار کی بھینٹ چڑھایا ہے کہ ان کی قربانی سے ہزاروں انسانوں کی جانیں محفوظ رہ سکیں“ نظام الدین نے اپنی سفاکی کی وضاحت کی تو الن بابا ہلکے سے مسکرا دیئے۔ اس سے پہلے وہ کچھ اور گفتگو کرتے ٹوبی نے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنا شروع کر دیا۔ نظام الدین نے سر اٹھا کر دیکھا تو بدروحیں بازوں کی شکل میں ان کی طرف آنے لگیں۔ نظام الدین نے تلوار نکالی اور تیار ہو گیا۔ ادھر الن بابا نے وظیفہ شروع کر دیا اور اپنے سامنے آگ جلالی۔ باز ان پر حملہ آور ہوتے گئے اور نظام الدین تلوار کے وار سے انہیں زخمی کرتا رہا۔ نجانے تلوار میں کیا بات تھی کہ ایک وار لگتے ہی باز گرتا اور الن بابا اس پر پھونک مارتے تو وہ بے دم ہو جاتا۔ کتا باز کو اٹھاتا اور فوراً منہ میں دبا کر اسے آگ میں پھینک دیتا۔

تقریباً چالیس پچاس بازوں کا قلع قمع ہوتو باز ختم ہو گئے۔ لیکن بابا نے ابھی



اشارہ نہیں دیا وہ نظام الدین کے ساتھ قلعے کے دروازے پر پہنچا۔ تالا توڑ کر قلعے میں داخل ہو کر اس کی دیواروں اور کمروں پر اچھی طرح پڑھ پڑھ کر دم کیا۔ تب انہوں نے کہا کہ اب پورا قلعہ اور اس کے اطراف بدروحوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ بابا نے یہ بھی بتایا کہ سینکڑوں برس پہلے دشمنوں نے اس قلعے پر رہنے والوں کو قتل کر کے یہیں چھوڑ دیا تھا اور باہر سے تالا لگا کر چل دیئے ہوں گے تبھی ان کی روحیں بھٹکنے لگیں اور یوں یہ قلعہ بازوں کا مسکن بن گیا۔ اس قلعے میں سے نظام الدین کو ایک خزانہ بھی ہاتھ لگا۔

ایک ماہ گزرا تھا کہ نظام الدین اور چودھری کا پورا گاؤں اس قلعے میں رہائش پذیر ہو چکا تھا۔ یہاں آبشار تھا، ہریالی تھی، گھنا جنگل تھا۔ اس بہادری اور دولت کی وجہ سے لوگوں نے نظام الدین کو اپنا راجہ تسلیم کر لیا تھا۔ یہ وہی ویرانہ تھا جہاں سالوں کوئی آدم زاد بھول کر بھی نہیں آتا تھا۔ آج اس کی آبادی، شہری آبادی کے قریب تھی اور لوگ سیر و تفریح کے لئے قلعہ نظامی آتے تھے اور لطف اٹھاتے تھے۔

☆☆☆

## ملائکہ شہزادی

**بادشاہ** نے فوج کو حکم دے دیا تھا کہ وہ اپنا دارالحکومت تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ موجودہ دارالحکومت غیر محفوظ ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی ریاست کا راجہ حملہ کرتا ہے در نقصان پہنچا کر چلا جاتا ہے۔ بادشاہ نے سوچا اگر وہ اسی طرح سارا سال اپنے دفاع کے چکر میں رہا تو پھر ملک کی ترقی اور قوم کی خوشحالی کیلئے کب کام کرے گا۔ وہ ایک رحمدل اور نیک سیرت انسان تھا۔ اس کے دل میں خدا ترسی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ رب العزت نے اسے کسی ریاست کا بادشاہ بنا کر حکومت کا انتظام اس کے ہاتھ میں دیا ہے تو اس پر کچھ فرائض بھی عائد

ہوتے ہیں۔ ورنہ قیامت میں اس سے باز پرس ہوگی۔ وہ ملک کی ترقی کے لئے بھی کام کرنا
چاہتا تھا اور قوم کی فلاح و بہبود کے لئے بھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے سوچا کہ دارالحکومت کو ایسے
شہر میں منتقل کر دیتے ہیں جو پہاڑوں سے گھرا ہو اور حملہ آوروں کی اس شہر تک رسائی
آسانی سے نہ ہو۔ اس لئے اس کو ایک شہر ایسا نظر آیا جو دو طرفوں سے اونچے اونچے پہاڑوں
سے گھرا ہوا اور ایک طرف سے جنگلات نے اسے محفوظ کر رکھا تھا۔ چوتھی طرف آبادی تھی۔
شہر اور شہر آبادی بادشاہ کی لیاقت نے اسے اسی شہر کو دارالحکومت بنانے پر اکسایا۔ تیاریاں مکمل
ہو چکی تھیں۔ اس نئے دارالحکومت میں مرمت اور تعمیراتی کام مکمل ہو چکے تھے۔ بادشاہ
سلامت، اکلوتے شہزادے اور دو شہزادیوں کیلئے محلات تعمیر کر دیئے گئے تھے۔ ایک بہت
مضبوط قلعہ بنایا گیا جسے دیکھ کر لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ قلعہ نا قابل تسخیر ہے۔ اس قسم کے تمام کام
نبٹانے کے بعد آج روانگی تھی۔ اس لئے گھوڑے، ہاتھی اور اونٹوں کو سجا دیا گیا تا کہ دونوں
شہزادیاں، شہزادہ اور بادشاہ ملکہ ان پر آسانی اور پرسکون حالت میں سفر کر سکیں۔ پہاڑی
راستوں سے انہیں جانا تھا لیکن بادشاہ نے اعلان کروا دیا کہ آج دارالحکومت کی طرف ان کی
روانگی ہے اس لئے ان کا قافلہ میدانی علاقے سے ہوتا ہوا نئے دارالحکومت میں قدم رنجہ ہوگا۔
یہ جھوٹ نہیں تھا بلکہ ایک سیاسی چال تھی۔ اکثر ایسے مواقع پر بادشاہ اور اس کے خاندان کے
دشمن حملہ کر کے پورے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے اور خود راج محل پر قبضہ کر کے
اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیتے تھے جبکہ افواج کے اعلیٰ افسران کو بھاری رقموں کے عوض خرید
لیتے تھے۔ اس لئے بادشاہ سلامت کا قافلہ کچھ دیر کو میدانی علاقوں سے گزرتا رہا۔ جب تک وہ
عوام کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ کافی دور جا کر بادشاہ نے اپنے محافظوں کو حکم دیا کہ وہ
یہ راستہ چھوڑ کر پہاڑی سلسلے سے سفر طے کریں۔ محافظ بھی سمجھ گئے کہ اعلان کرنا بادشاہ کی
سیاسی چال تھی۔ سردیوں کے دن تھے۔ پہاڑوں پر برف باری کا سلسلہ جاری تھا۔ جس کی وجہ
سے انہیں سردی کا احساس بھی ہو رہا تھا اور گھوڑوں، اونٹوں اور ہاتھیوں کا چلنا بھی مشکل ہو رہا



لیکن پھر بھی وہ مشکلات برداشت کرتے ہوئے مسلسل سفر کرتے رہے۔ کھانا پینا بھی پالکیوں
میں ہوتا رہا۔ دو دن اور ایک رات گزر گئی تھی۔ یہ تیسری رات تھی کہ ابھی دارالحکومت سے
کئی میل دور ہوں گے کہ ان پر حملہ کر دیا گیا۔ بادشاہ کی سیاسی چال بھی ناکام ہو گئی۔ لیکن وہ
بھی سنبھل گئے کیونکہ حملہ آور کسی ریاست کی فوج نہیں تھی بلکہ ڈاکو تھے جن کا مقصد لوٹ مار
کرنا تھا۔ محافظوں نے کافی دیر تک ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا اور انہیں لوٹ مار کرنے سے روکے
رکھا۔ لیکن ڈاکوؤں کا تازہ دم دستہ آ پہنچا تھا جس کی وجہ سے بادشاہ اور شہزادے کو بھی بذات خود
لڑائی میں حصہ لینا پڑا۔ کنیزوں نے ملکہ اور دونوں شہزادیوں کو ایک پناہ گاہ میں رکھا لیکن ڈاکو
اس جگہ بھی پہنچ گئے۔ ملائکہ چھوٹی شہزادی کے نام سے مشہور تھی اور بڑی شہزادی کا نام سعدیہ
تھا۔ بڑی شہزادی ڈرپوک اور بزدل تھی۔ لڑائی، ڈاکو اور خون دیکھ کر بے ہوش ہو گئی۔ جسے ملکہ
اور کنیزوں نے سنبھالنے اور ہوش میں لانے کی بہت کوشش کی۔ ایک ڈاکو نے ملائکہ شہزادی
کو لوٹنے کی بہت کوشش کی لیکن شہزادی اپنے زیورات اور دیگر سامان کو ٹوکری لئے اِدھر اُدھر
بھاگ بھاگ کر اس سے بچتی رہی۔ اس کھیل میں وہ آگے کی جانب دوڑتی رہی اور ڈاکو اس
کا پیچھا کرتا رہا۔ موقع پا کر شہزادی ایک درخت کے پیچھے چھپ گئی۔ درخت کے اندر کافی جگہ
تھی جبکہ شہزادی نہایت اسمارٹ تھی وہ آسانی سے اس میں سما گئی اور اس کی ٹوکری بھی۔ ڈاکو
نے بہت ڈھونڈا لیکن شہزادی اس کے ہاتھ نہ آئی۔ وہ ہمت ہار کر پاؤں پٹختا ہوا واپس چلا گیا۔
جب شہزادی کو اطمینان ہو گیا کہ ڈاکو واپس جا چکا ہے تو وہ باہر نکل آئی۔ اس کے ساتھ اس کے
سامان کی ٹوکری بھی تھی۔ جس میں اس کا تاج، سچے موتیوں کا ہار، کھانے پینے کا سامان اور
دیگر ضروریات زندگی کی چیزیں تھیں۔ وہ درخت کی اوٹ سے باہر تو آ گئی لیکن ہر طرف
گھپ اندھیرا تھا۔ شاید رات کا پچھلا پہر گزر رہا تھا کیونکہ چاند اپنا سفر آدھے سے زیادہ
طے کر چکا تھا۔ جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ آدھی رات گزر چکی ہے۔ وہ صبح ہونے کے انتظار
میں وہیں برف پر بیٹھ گئی۔ اسے سردی لگ رہی تھی۔ جبکہ اس نے ایک چادر اور ایک کمبل اوڑھ

بھی رکھا تھا۔ اس کے سر پر شال، پاؤں میں موزے اور جوتے تھے۔ پھر بھی اسے سردی مح
ہو رہی تھی کیونکہ برف باری سے جو سردی محسوس ہوتی ہے وہ ناقابل برداشت ہوتی ہے۔
شہزادی بھلا اس تاریک رات میں اپنے قافلے کو کیسے ڈھونڈ پاتی۔ نجانے وہ ڈاکو سے
کے لئے کتنی دور نکل آئی تھی۔ اسے دور دور تک کوئی آبادی یا روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ و
ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ ذرا سی بھی گھبراہٹ کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں نہیں تھے
وہ ایک بہادر شہزادی تھی جو ہر مشکل کا مقابلہ اور مصیبت کا سامنا کرنے کی قابلیت اور ہم
رکھتی تھی۔

ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اسے اندھیری رات میں اپنے قریب چاند
سی چمکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے غور سے دیکھا تو وہ سفید روشنی بکھر کر کبھی اس طرف رو
سا ہالہ بنا لیتی اور کبھی اس طرف۔ رفتہ رفتہ شہزادی کی سماعت سے کسی کے قہقہوں کی آواز
ٹکرانے لگی۔ ہاہاہا۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔ شہزادی سمجھ گئی کہ کوئی اسے ڈرا رہا ہے لیکن وہ بہ
ہمت والی اور دل والی لڑکی تھی۔ ذرا بھی نہیں ڈری۔ "میں جن ہوں۔ میں تمہیں کھا جاؤں
گا۔ ہاہاہا۔۔۔" یہ جملہ سن کر شہزادی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے جنوں کی بہ
سی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ وہ جنوں کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے بچپن سے شوق تھا کہ جنوں
دیکھے۔ کیا واقعی جن بہت ڈراؤنی شکل کے ہوتے ہیں۔ "تم جن ہو، تم سامنے کیوں نہیں
آتے؟ بزدل اور ڈرپوک انسانوں کی طرح سامنے آنے سے ڈر کیوں رہے ہو؟" شہزاد
نے اسے غیرت دلائی تاکہ وہ جلد از جلد سامنے آئے اور وہ جنوں کو دیکھنے کی تمنا پوری
سکے۔ "اگر میں اپنی اصلی حالت میں تمہارے سامنے آ گیا تو خوف سے تمہاری جان نک
جائے گی۔ تم مجھے دیکھ کر ایسے بے ہوش ہو جاؤ گی کہ پھر کئی مہینے تک ہوش میں نہ آ سکو گی"۔
جن کی بے وقوفی کی باتیں سن کر شہزادی ملائکہ کو مزید ہنسی آئی جسے وہ روک نہیں
سکی۔ "بزدل جن تم کہہ رہے ہو کہ اگر تم میرے سامنے اپنی اصلی حالت میں آ جاؤ گے تو خوف



مہاری جان نکل جائے گی اور پھر آگے کہہ رہے ہو کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔ کیسی بے
کی کی باتیں ہیں۔ بے وقوف جن اگر میں تمہیں تمہاری اصلی حالت میں دیکھ کر مر جاؤں گی
بے ہوش کیسے ہو سکوں گی۔ کیا تمہاری دنیا میں لوگ مر کر بے ہوش بھی ہو سکتے ہیں؟"
شہزادی نے اسے بے وقوف کہا اور اس کی بے وقوفی کی دلیل بھی دے دی تو
بہت غصہ آیا اور اس روشنی نے آہستہ آہستہ وجود میں آنا شروع کر دیا۔ پہلے اس کا سر بنا۔
ادی نے دیکھا کہ اس کے سر کے بال تیر کی طرح تنے ہوئے تھے اور بالوں کی نوکیں
ن کے سرے لگ رہے تھے۔ اس کی ابرو نہایت باریک لیکن کمان کی طرح بنی ہوئی تھیں۔
جن کی ناک کا بھی جواب نہیں تھا۔ جیسے بچے پنسل سے کوئی نوک دار چیز بنا دیتے ہیں۔
دی ملائکہ کو ایک لمحے کے لئے حیرت ہوئی کہ اس کی ناک میں ایک بڑا سا سوءا آر پار ہو گیا
لیکن اگلے ہی لمحے اس کی حیرت غائب ہو گئی۔ کیونکہ اس نے غور سے دیکھا تو وہ سوءا ناک
آر پار نہیں ہو رہا تھا بلکہ وہ جن کی مونچھیں تھیں۔ انتہائی باریک اور سوئے کی طرح۔ اس کا
جسم کا حصہ نمودار ہوا تو دیکھا کہ ایک بہت بڑی سفید کھال اس کی گردن سے لے کر سینے
کی ہوئی ہے۔ یہ کھال بھی نوک دار بناوٹ کی بنی ہوئی ہے۔ جن کی ابھی تک جتنی بھی
نظر آئی تھیں۔ وہ سب کی سب نوک دار بناوٹ پر مشتمل تھیں۔ کہیں اس جن کا نام نوکیلا
نہیں تھا۔ شہزادی ملائکہ دل ہی دل میں یہ باتیں سوچ کر مسکرا دی۔ "کیا تمہیں اب بھی
نہیں آ رہا۔ کیا تم مجھ سے اب بھی خوفزدہ نہیں ہوئی؟" جن نے اضطرابی کیفیت میں
ا کیا۔

"نہیں بے وقوف جن! مجھے ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا بلکہ ہنسی آ رہی ہے۔
یہ میں نے اتنی ستواں ناک اس سے پہلے نہیں دیکھی"۔
یہ سن کر جن غیض و غضب میں آ گیا۔ وہ گرج دار آواز میں بولا۔ "لڑکی اب تیری
نہ نکل جائیں تو پھر کہنا۔ یہ دیکھو"۔ جن نے اپنے ہاتھ دکھائے۔ اس کے ہاتھوں میں

بازوؤں تک ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں۔ انگلیوں کی جگہ پر بھی ڈھانچہ ہی تھا۔ انگلیوں میں گوشت کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ کہنی کے پاس نجانے کس قسم کی کھال تیر کی شکل میں پیوست تھی اور یہ تیر نما کھال اس کے دونوں ہاتھوں میں چھ یا سات جگہوں سے تنی ہوئی تھی۔ لیکن کہنی سے کاندھے تک اس کا جسم سلامت تھا۔ یعنی اس پر گوشت بھی تھا۔ اس نے ڈرانے کے لئے اپنے ہاتھ کا ڈھانچہ شہزادی کی طرف بڑھایا لیکن اب بھی وہ خوف زدہ نہ ہوئی، تب آخر کار جن نے اپنا پورا وجود اس کے سامنے ظاہر کر دیا۔ حقیقت ہے کہ اگر کوئی اور عام سی لڑکی ہوتی تو یقیناً خوف سے اس کی جان نکل جاتی لیکن یہ حواس کی پکی لڑکی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ملائکہ شہزادی نے ایسے بہت سارے جن پہلے بھی دیکھے ہوں۔ اسی لئے وہ اس سے خوفزدہ نہیں ہو رہی تھی۔ اس جن کے پیروں کی بناوٹ بھی ہاتھوں جیسی تھی۔ پیروں کی دس انگلیاں ڈھانچہ بنی ہوئی تھیں۔ بس اس کے پیٹ سے لے کر رانوں تک عجیب وغریب کھال لٹک رہی تھی۔ وہ ملائکہ شہزادی کو ڈرانے کی بہت کوشش کر رہا تھا لیکن اسے جن کی حرکتوں سے بجائے خوف کے مذاق سوجھ رہا تھا۔

"سنو! بھائی جن! اب تمہارا کھیل ختم ہو گیا ہے۔ جاؤ! فجر کا وقت ہونے والا ہے۔ اگر تم نہیں جاتے تو میں تمہیں روانہ کر دیتی ہوں"۔ یہ کہتے ہوئے شہزادی نے اپنے سامان کی ٹوکری سے سفید اور کالے دانوں والی تسبیح نکالی اور با آواز بلند "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" پڑھنے لگی۔ لاحول پڑھنا تھا کہ شیطان فوراً غائب ہو گیا۔ شہزادی کی بصیرت پر حیرانی تھی کہ وہ اس کی آواز سے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ جن نہیں شیطان ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جانتی تھی کہ شیطان انسان کو بہکا کر گھناؤنے اور خطرناک کام تو کر سکتا ہے لیکن خود اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یعنی اگر چاہے کہ شیطان تھپڑ مار دے تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ ہاں اگر جن چاہے تو ایسا ممکن ہے۔ اسی وجہ سے شہزادی شیطان سے خوفزدہ نہ ہوئی۔ اب شیطان کا سایہ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ کیونکہ فجر کا وقت ہو چلا تھا۔ دور کہیں سے اذان کی آواز آئی تو شہزادی وضو کرنے



کے لئے پانی تلاش کرنے لگی۔ پہاڑی سے نیچے اترنے پر اسے ایک کنواں نظر آیا۔ اس نے اس کنویں میں ڈول ڈال کر پانی حاصل کیا۔ وضو کر کے ایک شال بچھا کر مصلے کا کام لیا اور ایک چادر کو اوڑھ کر نماز ادا کی اور دعا مانگی کہ وہ اپنے والدین سے جلد مل جائے"۔ شہزادی ابھی دعا مانگ کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ اسے اپنے قریب دو نوجوان لڑکیاں کھڑی نظر آئیں جو کنویں سے پانی لینے کے لئے آئی تھیں۔ "تم کون ہو؟ اور یہاں رات کے وقت اکیلی اتنی سردی میں کیا کر رہی ہو"۔ ان میں سے ایک لڑکی نے پوچھا۔

"میں اس ملک کے بادشاہ کی بیٹی ہوں۔ شہزادی ملائکہ۔۔۔۔ اپنے والدین کے ساتھ نئے دارالحکومت جا رہی تھی کہ راستے میں ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا اور میں ڈاکو سے بچنے کے لئے وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس کھیل میں اپنے قافلے سے بہت دور نکل آئی۔ رات کی تاریکی میں مجھے کوئی آواز یا روشنی نظر نہیں آئی۔ اس لئے میں نے رات اس درخت کے نیچے برف پر بیٹھ کر گزاری ہے"۔ ملائکہ شہزادی کا نام سن کر دوسری لڑکی کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔ وہ بڑے پیار سے بولی۔ "آؤ بہن ہمارے گھر چلو۔ تم تو ہمارے رحمدل بادشاہ کی بیٹی ہو۔ میں اپنے بابا سے کہہ کر تمہیں نئے دارالحکومت تک پہنچا دوں گی"۔ لڑکی نے نیلم کا ہاتھ تھاما اور گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

"دیکھو! اماں جان آج ہمارے گھر کون آیا ہے؟" گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنی اماں کو پکارا۔ آواز سن کر اس کے والدین صحن میں آ گئے۔ "تم۔۔۔ تم تو رات کو بچ گئی تھیں۔ اب خود بخود میرے پاس آ گئی ہو۔ اب تم اپنے سامان کی حفاظت کیسے کرو گی؟" لڑکی کے باپ نے ملائکہ شہزادی کو دیکھتے ہی خوشی کا اظہار کیا۔

"ابا جان! کیا تم اسے جانتے ہو؟" لڑکی نے انتہائی حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں بیٹی یہ وہی شہزادی ہے جو کل رات مجھے دھوکہ دے کر نجانے کہاں چھپ گئی تھی اور مجھے افسوس ہو کر رہ گیا تھا کہ میں اس کا سامان چھین نہیں سکا۔ اب دیکھو مجھے میری

محنت کا صلہ خود بخود مل گیا ہے"۔ ملائکہ بھی پہچان چکی تھی کہ یہ شخص وہی ڈاکو ہے جو کل رات اس کے پیچھے پڑ گیا تھا جس سے بچ کر وہ ایک درخت کے تنے میں چھپ گئی تھی اور اس کی وجہ سے اپنے قافلے سے بچھڑ گئی تھی۔

"ڈاکو تم میرا سارا سامان لے لو لیکن مجھے میرے والدین کے پاس پہنچا دو"۔ ملائکہ نے اپنے سامان کی ٹوکری اس ڈاکو کی جانب بڑھاتے ہوئے گزارش کی۔ "اب تو سارا سامان بھی ملے گا اور ساتھ میں تاوان بھی۔ میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں چھوڑوں گا"۔ ڈاکو کی آنکھوں میں دولت کی چمک چمکنے لگی۔ وہ خوشی میں پاگل ہوا جا رہا تھا۔

"تمہیں تاوان کے طور پر جتنا پیسہ چاہیے مجھے بتا دو۔ میں اپنے ابا حضور سے لے کر دے دوں گی لیکن مجھے نئے دارالحکومت پہنچا دو"۔ شہزادی نے تاوان والی شرط بھی منظور کر لی۔ لیکن وہ لالچی شخص اب بھی راضی نہ ہوا۔

"ابو جان! مجھے بھی شہزادی بننے کا بہت شوق ہے۔ اس لئے کیوں نہ ایسا کرتے ہیں کہ چند سال اسے اپنا قیدی بنا کر رکھتے ہیں اور جب اس کا چہرہ بے پہچان ہو جائے گا تب اس کی جگہ یہی کپڑے پہن کر اور یہی سامان نشانی کے طور پر لے کر میں بادشاہ سلامت کے پاس نئے دارالحکومت جاؤں گی اور ساری کہانی دہراؤں گی۔ جو میں نے ابھی آپ سے اور اس شہزادی کی زبانی سن کر ازبر کر لی ہے۔ اس طرح میں راج محل میں عیش کروں گی اور یہ یہیں پر قید میں رہے گی۔ ابو جان! آپ بھی فکر نہ کریں۔ میں آہستہ آہستہ محل کا سارا خزانہ آپ کے پاس پہنچا دوں گی"۔ یہ ترکیب سن کر ڈاکو کی حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"ٹھیک ہے بیٹی! تمہاری ترکیب مجھے پسند آئی۔ جاؤ اس کے کپڑے تبدیل کر کے اسے اپنا جیسا لباس پہنا دو اور یہ لباس پیٹی میں محفوظ کر دو اور ہاں اس کے سامان کی ایک ایک چیز محفوظ رکھنا"۔ باپ اور بیٹی نے اپنی ترکیب پر عمل کیا۔ دوسرے دن انہیں خبر ملی



ہ ڈاکوؤں کے مقابلے میں ان کے چند سپاہی مارے گئے ہیں اور بادشاہ سلامت اور زادے کو زخم آئے ہیں۔ ڈاکوؤں نے سارا سامان لوٹ لیا تھا۔ ملکہ کو اس حملے، بادشاہ اور یے کے زخمی ہونے کے غم اور چھوٹی شہزادی کے گمشدہ ہونے کے صدمے نے اس قدر ھال کیا کہ وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ شہزادی ملائکہ اپنی ماں کے انتقال کی خبر سن کر ت روئی کہ اس کی ماں اس کی جدائی برداشت نہ کر سکی اور اس صدمے سے اپنی جان دے ی۔ اب تو ملائکہ کو اس ڈاکو اور اس کی بیٹی پر بہت غصہ آیا۔ ان لوگوں کی وجہ سے یہ سب کچھ تھا۔ اس خبر کے اگلے روز ایک منادی ندا کرتا ہوا آیا۔ بادشاہ سلامت کی چھوٹی بیٹی شہزادی ئکہ لاپتہ ہو گئی ہے۔ اطلاع دینے والے کو منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ یا شہزادی کی خبر دینے لے کو جھولی بھر اشرفیاں انعام میں دی جائیں گی"۔

منادی اعلان کرتا گزر گیا تو اس ڈاکو کی بیٹی نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا۔ دں نے شہزادی پر کڑا پہرہ بٹھائے رکھا تھا۔ کبھی اس کو تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔ اس حالت ، دو سال گزر گئے۔ اب ڈاکو کی بیٹی کی نیت خراب ہونے لگی اور اس پر شہزادی بننے کا خمار ھنے لگا۔ اس نے اپنے باپ سے اپنی خواہش کا ذکر کیا۔ باپ نے اجازت دے دی۔ آج وکو اپنی بیٹی کو بادشاہ سلامت کے پاس دربار میں لے کر جانے والا تھا۔ لڑکی نے صبح و یرے ہی سے تیاری شروع کر دی تھی۔ شہزادی کا لباس نکالا اور اسے پہن لیا۔ اس کا سامان لا اور جھاڑ کر چمکا دیا۔ سامان کو اسی طرح ٹوکری میں رکھا اور اپنی چھوٹی بہن کو ساتھ لے کر نہ ہونے لگی"۔ بیٹی اس سبز قدم کو ساتھ کیوں لے کر جا رہی ہو؟ یہ منحوس ہے جس سے اس ر میں آئی ہے۔ سبھی کچھ چھن گیا ہے ورنہ ہر روز کامیاب ڈاکہ ڈالتا تھا اور مال ہی مال "۔ ڈاکو کی بات سن کر اس کی بیٹی نے کہا۔ "بابا جان میں اسے اپنی کنیز بنا کر لے جا رہی ں۔ کہیں مصیبت میں مبتلا ہوتا دیکھوں گی تو اسے پھنسا کر راہ فرار اختیار کر جاؤں گی۔ ورنہ شاہ سے کہوں گی کہ اس لڑکی نے مجھے دو سال تک کھلایا پلایا ہے اور امن و سکون سے رکھا

ہے۔اس لئے اس کو انعام و اکرام اور میری یعنی شہزادی ملائکہ کی جان کا صدقہ دے کر
کرو۔اس طرح محل میں سے اس منحوس کا پتہ بھی صاف ہو جائے گا اور تمہارے پاس مال
آ جائے گا"۔ بیٹی کی بات سن کر ایک بار پھر ڈاکو حیران ہوا اور وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

پچاس میل کا فاصلہ انہوں نے چند گھنٹوں میں طے کر لیا۔ کیونکہ ڈاکو کے پاس
تیز رفتار اور تجربے کار گھوڑے تھے جن کی مدد سے اس کی دونوں بیٹیاں اور وہ بہت جلد
کے دربار میں پہنچ گئے۔ڈاکو ذہین تھا پکڑے جانے کے ڈر سے دور ہی رک گیا اور ان دو
کو محل میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ دربان نے انہیں اندر جانے
روکا۔لیکن ڈاکو کی بیٹی نے کہا۔"بدتمیز، نالائق غلام تم ہمیں پہچانتے نہیں ہو۔ہم شہزادی ما
ہیں۔تمہارے آقا کی چھوٹی شہزادی، دو سال کی قید تنہائی اور حبس بے جا کی سزا کاٹ کر آ
ہیں۔چلو راستہ چھوڑو"۔ڈاکو کی بیٹی زبردستی محل میں داخل ہو گئی۔شور شرابے کی آواز س
وزیر، مشیر، خاص خدام دوڑے چلے آئے۔ دربان نے بتایا کہ یہ لڑکی خود کو شہزادی ملائ
رہی ہے۔ اسی اثناء میں بادشاہ سلامت بھی اس طرف آ نکلے۔سب نے آداب بجا
شہزادی ملائکہ بھی آداب بجا لائی اور ابا حضور کہہ کر بادشاہ سلامت کے گلے لگ کر رونے لگ

"ابا حضور! کیا ہم دو سال میں اس قدر بدل گئے ہیں کہ یہاں کے وفادار ا
بھی ہمیں پہچانتے نہیں ہیں۔ چلو ہمارے تو دماغ پر اس دن چوٹیں آئی تھیں جس دا
پرانے دارالحکومت کو خیر باد کہہ کر نئے دارالحکومت کی طرف آ رہے تھے اور یہاں سے پا
میل دور ہمارے قافلے پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تھا۔میں ڈاکوؤں سے بچنے کے لے دوڑ
تھی کہ اندھیرے کی وجہ سے میرا پاؤں بڑے سے پہاڑی پتھر سے ٹکرایا اور میں پہاڑ پر
لڑھکتی ہوئی نیچے جا گری۔میرے سر میں چوٹیں آئی تھیں۔میں دو سال تک اپنے حواس کھو
رہی اور آج مجھے ہوش آیا اور سب کچھ یاد آیا تو میں آپ کے پاس دوڑی چلی آئی۔ وہ تو بھ
اس گاؤں کی گوری کا۔جس نے دو سال تک مجھے کھانا کھلایا اور اپنے پاس رکھ کر میری



بحال کی۔آج میں بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں تو یہ دربان بھی مجھے پہچاننے سے انکار کر رہا تھا۔اور
اندر نہیں آنے دے رہا تھا۔ابا حضور آپ ان لوگوں کی تربیت پر توجہ دیں اور ہاں اس گاؤں کی
گوری کو ہماری دو سال تک خدمت کرنے کا صلہ دے کر روانہ کر دیں کیونکہ اس کے والد انعام
و اکرام کے لالچ میں باہر کھڑے ہو کر دولت ملنے کا انتظار کر رہے ہیں"۔

بادشاہ سلامت کو جیسے دو سال کی فلم آنکھوں میں گھوم گئی۔ایک ایک سین نظر آنے
لگا۔ڈاکوؤں کا حملہ۔محافظوں کا مقابلہ۔ڈاکوؤں کے تازہ دم دستے کی آمد۔بذات خود بادشاہ
سلامت اور شہزادے کا تلوار چلانا۔زخم کھانا اور سب سامان لٹ جانا۔بڑی بیٹی کا بے ہوش ہو
جانا اور صدمے سے ملکہ کا انتقال ہو جانا۔بادشاہ سلامت کے سبھی زخم ہرے ہو گئے تھے لیکن
شہزادی ملائکہ کو پا کر اس کے زخموں پر مرہم رکھی گئی تھی۔بادشاہ سلامت نے فوراً اپنے گلے
سے سچے موتیوں کی مالا اتار کر شہزادی ملائکہ کا صدقہ اتارا اور شہزادی ملائکہ کے ساتھ آئی ہوئی
کنیز کو عطا کر دی۔شہزادی ملائکہ نے اپنی چھوٹی بہن کو آنکھیں نکال کر اشارہ کیا کہ وہ فوراً
یہاں سے دفع ہو جائے۔اس کی چھوٹی بہن بادشاہ سلامت کے حضور آداب بجا لا کر واپس
پلٹ گئی۔وہ سوچ رہی تھی کہ ان لوگوں نے مجھے منحوس اور سبز قدم کہا تھا اور پھر اسے اصلی
شہزادی ملائکہ کی بھی مدد کرنا تھی۔اسے ڈاکو باپ کی قید سے رہائی دلا کر راج محل تک لانا تھا۔
وہ ست قدموں سے دوبارہ سے باہر کی طرف جا رہی تھی کہ سامنے سے شہزادہ آتا دکھائی دیا۔
اس نے بڑی اداؤں سے شہزادے کو آداب کیا اور خراماں خراماں چل کر اس کے قریب آ کر
کہنے لگی۔"شہزادے صاحب! میں آپ سے اکیلے میں ملنا چاہتی ہوں۔

شہزادی کو اس کی ادائیں خوب لگیں۔اس نے کنیزوں کو حکم دیا کہ وہ اسے لے کر
اس کے کمرے میں پہنچیں تا کہ وہ جس کام کے لئے ملنا چاہتی ہے وہ کھل کر بات کر سکے۔
شہزادہ بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس پر انکشاف ہوا کہ دو سال کی گمشدگی کے
بعد شہزادی ملائکہ بازیاب ہو گئی ہے۔اس نے شہزادے کو کبھی نہیں دیکھا تھا وہ پہچان نہ سکی

اور بری نیت سے شہزادے کو گھورنے لگی۔ بیٹی یہ تمہارا بھائی شہزادہ حمید الدین ہے۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ یہ کیا حرکت کر رہی تھی اس سے تو بادشاہ کو شک ہو جاتا۔ اس نے فوراً وضاحت کی۔

"بھائی صاحب دراصل دو سال تک۔۔۔"

"بیٹی تم جا کر آرام کرو۔ میں شہزادے کو ساری حقیقت بتا دوں گا"۔ بادشاہ نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔ شہزادی نیلم کنیزوں کے ساتھ اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئی اور بادشاہ سلامت نے شہزادے کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ شہزادے نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ بادشاہ حضور سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں آیا تو اس لڑکی کو موجود پایا۔ شہزادے نے تمام افراد کو اشارہ کیا کہ اسے تخلیہ چاہیے۔ سب کے جانے کے بعد وہ اس لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔

"بولو! تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟" شہزادے نے اس کو بات کرنے کا موقع دیا۔

"شہزادے صاحب! میری بات کو غور سے سنو، میرے بعد شاید کوئی اس حقیقت سے پردہ نہ اٹھا سکے اور تم لوگ ساری عمر اندھیرے میں رہو"۔

شہزادے نے اس کے منہ پر تجسس باتیں سنیں تو ہمہ تن گوش ہو گیا اور وہ لڑکی اس کے گوش گزار کرنے لگی۔

"یہ جو شہزادی ملائکہ بن کر آئی ہے۔ یہ میری بڑی بہن ہے۔ اس نے دو سال سے اصل شہزادی ملائکہ کو اپنے گھر میں قید کر رکھا ہے۔ میں تمہیں شہزادی ملائکہ تک لے جا سکتی ہوں"۔ شہزادہ حمید الدین اس کے منہ سے اتنا بڑا راز افشا ہونے پر حیران تھا بلکہ پریشان بھی۔ اس نے نہایت رازداری سے سالار کو بلایا اور کہا۔ "دیکھو کسی بھی صورت میں شہزادی ملائکہ کو محل سے باہر نہ جانے دیا جائے۔ چاہے بادشاہ حضور کا ہی حکم کیوں نہ ہو۔ جب تک تمہیں



شہزادی ملائکہ کو روکے رکھنا ہے۔ جب تک میں واپس نہیں آ جاتا"۔ اس نے سالار سے مزید کہا۔ "جلد از جلد چار گھوڑے تیار کر دے اور کچھ لڑاکا محافظ بھی میرے ساتھ کر دے"۔

سالار نے حکم کی تعمیل کی اور شہزادے کو تیاری کی اطلاع۔ شہزادے نے اس لڑکی کو اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھایا اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ چند گھنٹوں کی مسافت کے بعد لڑکی اسے اپنے گھر لے آئی۔ اندر کمرے میں جا کر دیکھا تو ایک لڑکی سر جھکائے ہوئے چہرے کے ساتھ کونے میں بیٹھی ہے۔ وہ برسوں کی مریض دکھائی دے رہی ہے۔ شہزادے کو دیکھتے ہی برق رفتاری سے اٹھی اور بھائی صاحب کہہ کر اس کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ شہزادہ تمام احوال سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اسے اپنی بہن پر بہت ترس آیا اور ڈاکو پر انتہائی غصہ جب کہ گاؤں کی گوری پر پیار آیا کہ اس نے اتنے بڑے راز کو فقط اس کے سامنے آشکار کیا تھا۔ شہزادے نے شہزادی کو گھوڑے پر سوار کیا اور اس کے ساتھ گاؤں کی گوری کو بھی۔

"شہزادے! میرا کام ختم ہو چکا ہے میں ایک ڈاکو کی سوتیلی بیٹی ہوں جو مجھے منحوس اور سبز قدم کہتا ہے اور ظلم ڈھانے کے لئے مجھے مشق ستم بناتا ہے۔ اس لئے مجھے یہیں رہنے دو"۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو بھر چکے تھے۔

"ہم اپنے محسن کو بھلا کیسے تنہا چھوڑ سکتے ہیں۔ کیا تمہیں انعام و اکرام سے نوازا نہیں جا سکتا۔ چلو تم ہماری محسن ہو اور ہم شاہی لوگ کبھی بھی احسان فراموش نہیں ہوتے۔ ابھی تو تم نے اس فریب کار عورت کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے اصلی شہزادی ملائکہ کو پہچان عطا کرنی ہے اور ڈاکو کو گرفتار کرانا ہے۔ میں تمہیں حالات کے ظلم و ستم کے حوالے کیسے کر سکتا ہوں"۔ شہزادے نے محافظوں کو کوچ کا حکم دیا۔

شہزادے نے اصل شہزادی ملائکہ کو بائیں باغ والے دروازے سے محل میں داخل کیا اور اپنی محسن لڑکی کو تیار ہونے اور شہزادی کو تیار کرنے کا حکم دیا۔ کنیزوں نے بہت جلد شہزادی ملائکہ کو اس کے اصلی روپ میں تیار کر دیا اور گاؤں کی گوری کو دلہن کے روپ میں۔

دربار سجایا گیا اور نقلی شہزادی کو بلایا گیا جیسے ہی نقلی شہزادی ملائکہ آئی۔ شہزادے نے اسے گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ بادشاہ سلامت نے غصے میں آ کر کہا۔ ”شہزادے حمید الدین تم یہ کیا کر رہے ہو؟“

”ابا حضور! اصل شہزادی ملائکہ تو چار دن پہلے ہی محل میں آ چکی تھی پھر ہم اس نقلی ڈاکو کی بیٹی کو شہزادی کیسے مان لیں“۔

بادشاہ نے نقلی شہزادی ملائکہ سے پوچھا تو اس نے غصے میں کہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے میں تو اسے کمرے میں بند کر کے آئی تھی“۔ ابھی ان کی گفتگو جاری تھی کہ فوج کے سپاہی ایک ادھیڑ عمر شخص کو گرفتار کر کے لائے۔ ”بادشاہ سلامت یہ شخص شہزادی ملائکہ سے ملنے کی بات کر رہا تھا“۔ ایک اہلکار نے اسے بادشاہ کے سامنے پیش کرتے ہوئے بتایا۔

”ابا جان! ان لوگوں نے ہمیں گرفتار کر لیا ہے“۔ ڈاکو کی بیٹی منہ چھپا کر رونے لگی۔ ”اچھا ہوا تم بھی یہاں آ گئے۔ جو گڑھا حاتم نے اس گاؤں کی گوری کے لئے کھودا تھا اس میں خود ہی گر گئے۔ اللہ جسے عزت دینا چاہے اسے عزت مل کر رہتی ہے۔ ابا حضور! میں لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس نے ہماری بہن کو ہم سے ملوایا اور ان ظالموں کی قید سے آزاد کروایا“۔ بادشاہ نے پوری بات سمجھتے ہوئے شادی کی اجازت دے دی اور ڈاکو کو اس کی بیٹی سمیت عمر قید کی سزا سنا دی۔

☆☆☆

# شیر کا شکاری

**کریمو** بہت غریب انسان تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا اور کمہار کا کام کرتا تھا۔ وہ بہت اچھے اچھے چاک پر مٹی کے برتن بناتا اور انہیں فروخت کر کے روزی کماتا تھا۔ یہی اس کا ذریعہ معاش تھا۔ اس کے ہاتھ برتن بنانے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ



چکنی مٹی سے سونا کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ یہ کریمو کا ہنر ہی تو تھا جو مٹی کو سونا بنا کر بیچ رہا تھا۔ ان مٹی کے برتنوں میں مٹی کے گلاس، مٹکے، صراحیاں، پیسے جمع کرنے والے گلے، چھوٹی چھوٹی تھالیاں، کبوتروں کو دانے کھلانے اور پانی پلانے کے لئے کنڈالیاں اور مٹی کے کٹورے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی وہ کھیل کھلونے اور بہت سی چیزیں بناتا تھا۔ اسے کاروبار کا فن بھی پتا تھا وہ زیادہ تر وہی چیزیں بناتا تھا جن کی ضرورت زیادہ ہوتی تھی اور لوگ اس سے نام لے کر وہ چیزیں طلب کرتے تھے۔ اس لئے وہ مٹکے، گلے، پیالے اور صراحیاں زیادہ بناتا تھا کیونکہ گاؤں دیہات میں ٹھنڈا پانی اسے چکنی مٹی گھول کر اور اچھی طرح گوندھ کر دے دیتی تھی اور وہ چاک گھما گھما کر اسی مٹی سے برتن بناتا تھا۔ برتن تو اور کمہار بھی بناتے تھے لیکن جس قدر صفائی اور خوبصورتی کریمو کے ہاتھ میں تھی کسی اور کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ کریمو کا انتظار کرتے جب کریمو ان کی طرف برتن لے کر چکر لگاتا تب وہ اس سے ضرورت کی چیزیں خرید لیتے تھے۔ ان کی اور ان کے سبھی گاؤں والوں کی زندگی بڑی پرسکون اور آرام دہ گزر رہی تھی کہ ان کے گاؤں میں کہیں سے شیر آ گیا۔ شیر نے ایک دن جنگل سے نکل کر ایک بچے پر حملہ کیا وہ تو خدا کا شکر تھا کہ قریب ہی گاؤں کے مرد بیٹھے تھے انہوں نے شیر کو بچے پر حملہ کرتے ہوئے دیکھا تو ڈنڈے اور لاٹھیاں لے کر اس کی طرف دوڑے۔ اگر راستہ صاف ہوتا تو شیر بچے کو منہ میں دبا کر سیدھا جنگل میں بھاگ جاتا۔ لیکن اس کے راستے میں وہ لوگ آ گئے اور وہ راستہ بند ہو گیا جس سے شیر حملہ آور ہوتا تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر دیوار پر چڑھنا چاہتا تھا لیکن دیوار اس کی چھلانگ سے اونچی تھی وہ جیسے ہی نیچے گرا بچہ بھی اس کے منہ سے چھوٹ گیا اور لوگوں نے اس پر پے در پے ڈنڈوں اور لاٹھیوں کے وار کر دیئے۔ ضربیں بہت شدید تھیں، شیر نے زور سے دھاڑ کر ان پر حملہ کرنا چاہا لیکن جیسے ہی لوگ ڈر کر پیچھے ہٹے وہ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ ڈرپوک انسانوں

نے رات کے وقت گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا اور عقل مند انسانوں نے شیر کے حملے سے بچنے کے لئے حفاظتی تدابیر اختیار کرنا شروع کر دی تھیں۔ کسی نے گھر میں آگ کا اہتمام کر لیا تھا کیونکہ آگ جلانے سے شیر خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ کسی نے ڈنڈے اور لاٹھیاں تیار کر لی تھیں اور جس کے پاس تیر کمان اور تلواریں تھیں انہوں نے ان کو چمکا لیا تھا۔ ان کا مقابلہ ایک شیر سے تھا اور شیر کا شکار کرنا بچوں کا کام نہیں تھا۔ اس سے لڑنے کے لئے بہادر، طاقتور اور عقل مند انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ شیر بھی شیر ہوتا ہے۔ آسانی سے راہ فرار اختیار نہیں کرتا۔ مار دیتا ہے یا مر جاتا ہے۔ اس واقعہ کو گزرے آج تیسرا دن تھا کہ شیر نے نہر کے کنارے کپڑے دھوتی ہوئی ایک عورت کو دبوچ لیا اور اس کا ہاتھ چبا گیا۔ اس کے شور مچانے پر قریب ہی گھروں میں کام کرتی عورتوں نے دیکھا کہ شیر اس عورت کے جسم پر پنجے گاڑھے اس کا ہاتھ چبا رہا تھا۔ کئی عورتوں نے اپنے اپنے چولہے سے جلتی ہوئی لکڑیاں نکالیں اور شیر کی طرف اسے ڈرانے کو بھاگیں۔ دوسری طرف ایک کسان نے ایک تیر کمان میں کھینچ لیا اور شیر کا نشانہ لے کر چلا دیا۔ تیر اس کی کمر میں پیوست ہو چکا تھا لیکن شیر کے منہ کو انسان کا خون لگ چکا تھا۔ وہ اس عورت کا ہاتھ چھوڑنے پر تیار نہ ہوا۔ اتنی دیر میں کسان نے ایک اور تیر اس کی طرف چھوڑ دیا۔ اس بار تیر اس کی گردن میں اندر تک اتر گیا تھا۔ وہ تلملانے لگا اور دوسری طرف عورتوں نے اس کے اوپر جلتی ہوئی لکڑیاں پھینکنا شروع کر دیں اور اتنی ساری مصیبتوں سے بچنے کے لئے اسے راہ فرار اختیار کرنا پڑی لیکن وہ اس عورت کا ہاتھ چبا چکا تھا۔

شیر کے فرار ہونے کے بعد عورت کو جلدی سے گھوڑا گاڑی میں ڈال کر ہسپتال پہنچایا گیا جہاں اس کی جان تو بچا لی گئی لیکن وہ عورت ایک ہاتھ سے محروم ہو گئی۔ اس شیر کے حملوں کی شکایت لے کر لوگ اس گاؤں کے چودھری کے پاس گئے۔ چودھری نے ان کی باتوں کو غور سے سنا اور کہا کہ جو کوئی شخص اس شیر کا شکار کرے گا۔ اسے ہلاک کر دے گا یا جال میں جکڑے گا اسے دو گائیں، ایک اونٹ، تین بکریاں اور پانچ ہزار روپے انعام و اکرام ملے



گا۔ انعام بہت زیادہ تھا۔ اس لئے گاؤں کے نوجوانوں نے اپنے اپنے طور پر شیر کا شکار کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

نظام الدین ایک ماہر ماہی گیر تھا۔ وہ دن بھر دریا میں جا کر مچھلیاں پکڑتا تھا اور شام کے وقت گھر لوٹتا تھا۔ مچھلیاں پکڑنا اور ان کو بیچ کر روزی کمانا ہی اس کا پیشہ بھی تھا اور مشغلہ بھی۔ اس کے ذہن میں ترکیب آئی کہ کیوں نہ اس مچھلیوں کے جال کو مزید مضبوط کر کے بنا جائے اور اس کے ذریعے شیر کو جال میں جکڑ لیا جائے۔ اگر شیر جال میں پھنس گیا تو اس کو مارنا بے حد آسان ہو جائے گا۔ نظام الدین نے یہ سوچا کہ وہ دن بھر جال بنے گا اور رات کو شیر کا شکار کرے گا۔ نظام الدین نے جال بنا شروع کر دیا لیکن جال بننے کی ڈوریاں کم پڑ گئیں۔ اسے شہر سے جا کر ڈوریاں لانا پڑیں اور جال کو مضبوط کرنے میں بہت محنت لگی لیکن جا تیار ہو گیا۔ اس تیاری میں وہ دو تین دن تک دریا میں مچھلیاں پکڑنے بھی نہ جا سکا کیونکہ اسے فرصت نہیں ملی تھی۔ اور پھر اس نے سوچا کہ تین چار دن لگا کر شیر کر جکڑ لیا، تو دو گائیں، ایک اونٹ، تین بکریاں اور پانچ ہزار روپے انعام ملے گا جو کئی مہینوں تک کی کمائی کے برابر ہو گا۔

نظام الدین آج کی رات کا منصوبہ بنا چکا تھا کہ وہ آج رات جنگل میں جال بچھا دے گا اور جیسے ہی شیر اس کی طرف آئے گا وہ جال میں پھنس جائے گا۔ یوں شور مچا کر وہ سب گاؤں والوں کو بلا لے گا اور لوگ اسے لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے مار مار کر ہلاک کر دیں گے اور چودھری کی جانب سے مقرر کردہ انعام اسے مل جائے گا۔ نظام الدین ساری رات جال بچھائے ایک اونچے درخت پر رات بھر بیٹھا انتظار کرتا رہا لیکن شیر اس طرف نہ آیا۔ اس کی چار دن کی روزی کا بھی نقصان ہو چکا تھا اور جال بننے کی محنت بھی ضائع ہوتی نظر آ رہی تھی۔ لیکن وہ ہمت نہیں ہارا۔ دوسری رات بھی اس نے اسی طرح جال بچھا دیا اور رات بھر درخت پر بیٹھا جاگتا رہا۔ شاید آج قدرت اس پر مہربان تھی۔ اس نے دیکھا کہ دور سے شیر دبے پاؤں اس

طرف آ رہا ہے۔ جدھر نظام الدین نے جال بچھایا ہوا ہے۔ نظام الدین کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ نظام الدین نے ایک چالاکی اور کی تھی جس کی وجہ سے کافی حد تک کامیاب رہا۔ اس نے جال کے اس پار ایک بکری کا بچہ باندھ دیا تھا۔ تاکہ شیر اسے دیکھ کر اس پر جھپٹے اور جال میں پھنس جائے۔ شیر آہستہ آہستہ جال کی طرف آ رہا تھا۔ شیر کی نظر جیسے ہی جال پر پڑی وہ سمجھ گیا کہ کسی نے اسے جکڑنے کے لئے جال پھیلایا ہے۔ اس لئے اس کے اٹھتے قدم رک گئے۔

لیکن جیسے ہی شیر نے بکری کے بچے کی طرف دیکھا اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ شیر نے بکری کا بچہ دبوچنے کے لئے تیاری کی۔ ادھر بکری کے بچے کی نظر شیر کی بڑی بڑی چمکدار آنکھوں پر پڑی تو اسے اپنی موت نظر آئی۔ شیر نے بکری کے بچے کے لالچ میں اندھا ہو کر جیسے ہی اس پر چھلانگ لگائی وہ بری طرح جال سے ٹکرایا۔ جال سے ٹکرانا تھا کہ نظام الدین نے شور مچا دیا۔ گاؤں والوں جلدی آؤ۔ میں نے شیر کو جال میں پکڑ لیا ہے۔ گاؤں والوں جلدی آؤ۔ میری مدد کرو اور شیر کو ہلاک کر دو"۔ اس کی آواز سن کر لوگ بیدار ہو گئے اور ڈنڈے اور لاٹھیاں لے کر جنگل کی طرف دوڑے۔ کیونکہ جنگل کی سمت سے نظام الدین کی آواز آ رہی تھی سب اسی طرف دوڑ رہے تھے۔ ادھر شیر نے کسی آدم زاد کو شور مچاتے دیکھا تو وہ بھی چوکنا ہو گیا۔ پہلے تو اس نے جال کا جائزہ لیا اور پھر جدھر سے اس کو جال کمزور لگا دو تین مرتبہ زور زور سے پنجے مارے اور جال کو پھاڑ کر اس طرف سے نکل گیا بکری کا بچہ بندھا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ موت کے منہ میں چلا گیا۔ شیر نے بکری کے بچے کو منہ میں دبوچا اور لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔ اتنی دیر میں گاؤں والے وہاں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے غور سے دیکھا بلکہ رات کے اندھیرے میں لالٹین جلا کر دیکھا لیکن وہاں جال کے اندر کوئی شیر و یر نظر نہیں آیا۔ نظام الدین نیچے اتر آیا تھا۔ وہ لوگوں کو قسم کھا کھا کر یقین دلانے لگا کہ اس نے شیر کو جال میں جکڑ لیا تھا لیکن شیر جال پھاڑ کر بھاگ نکلا۔ نہ صرف اس کے چنگل سے آزاد ہو گیا بلکہ اس کے بکری کے بچے کو بھی لے گیا۔ لیکن لوگوں نے کہا کہ انعام کے لالچ میں تم اندھے



ہو گئے ہو۔ تمہیں کتا بھی شیر نظر آنے لگا ہے۔ یہ کہہ کر لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

بے چارہ نظام الدین جس نے تین چار دن کی دیہاڑی خراب کی۔ مچھلیاں پکڑنے نہ جا سکا۔ رات دن محنت کر کے جال بنا اور دو راتیں پیڑ پر بیٹھا جاگتا رہا۔ یہ سب ضائع ہو گیا اور الٹا اسے طعنہ ملا کہ وہ لالچ میں اندھا ہو گیا ہے۔ اس نے دل برداشتہ ہو کر کوشش ترک کر دی اور شیر کا خیال دل سے نکال کر دوبارہ مچھلیاں پکڑنے جانے لگا۔

ریمو پورے گاؤں میں ماہر نشانہ باز مانا جاتا تھا۔ جب گاؤں کا میلہ لگتا تھا تب بھی وہ اپنے پکے نشانوں کے کمالات دکھاتا تھا اور لوگوں سے داد وصول کرتا تھا اور تماش بینوں سے پیسے بھی کماتا تھا۔ نظام الدین کی ناکامی کے بعد ریمو کو خیال آیا کہ وہ شیر پر نشانہ بازی کر کے اسے زخمی کر دے اور زخمی حالت میں اسے قابو کرنا آسان ہو جائے گا۔ یہی سوچ کر وہ گاؤں کے لوہار کے پاس گیا اور بولا۔

"لوہار بھائی! مجھے پانچ تیر ایسے بنوانے ہیں جو لمبائی میں دوگنے بڑے ہوں اور نوک ان کی انتہائی تیز تر اور چوڑی ہو۔ پانچ تیروں کو زہر میں بھی بجھا کر تیار کرنا ہے۔ تم جتنے پیسوں کا معاوضہ چاہو گے تمہیں مل جائے گا"۔

ریمو کی باتیں سن کر دینا لوہار اس کے منہ کو تکنے لگا۔ "ریمو بھائی اس سے پہلے تم نے کبھی فرمائشی کام نہیں کروایا۔ اب ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی ہے؟ کیا کسی سے دشمنی ہو گئی ہے؟" دینا لوہار نے اس سے مذاق کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں دینا بھائی! اب آپ سے کیا چھپانا۔ دراصل میں شیر کا شکار کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بڑی فکر ہے کہیں وہ شیر ہمارے مزید آدمیوں کو جانی نقصان نہ پہنچا دے"۔ ریمو نے دل میں کڑھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھائی میں سمجھتا ہوں۔ اس شیر کا شکار کرنے سے آدمی بھی محفوظ رہیں گے۔

میرا مطلب ہے لوگوں کی جان بھی حفاظت سے رہے گی اور تمہارے پاس آکر مال بھی"۔ د
لوہار کی بات سمجھ کر وہ نادم بھی ہوا اور خوش بھی، اور کہنے لگا۔

"دینا بھائی! جب ہم اپنا مکان بناتے وقت کھڑکی یا روشن دان کھولتے ہیں تو اگر
یہ نیت کرلیں کہ اس میں سے اذان کی آواز آئے گی اور ہم نماز پڑھنے کے لئے وقت پر چا
جائیں گے تو اس نیت کا ہمیں ثواب ضرور ملے گا لیکن اس روشن دان سے ٹھنڈی ہوا اور روشنی
بھی آتی رہے گی۔ بس یوں ہی سمجھو کہ ایک تیر میں دو شکار ہو جائیں گے۔ شیر بھی مارا جائے
اور انعام بھی ہاتھ آئے گا۔ یوں عوام الناس کی خدمت بھی ہو جائے گی اور اپنی جیب کی عیشر
بھی"۔

ریمو کی باتیں سن کر لوہار کہنے لگا۔ "بھائی ریمو مجھے یقین ہے تو اچھا نشانہ باز ہے
اور میں تجھے تیر بھی زہر میں بجھا کر تیری خواہش کے مطابق بنا دوں گا اور سب سے بڑھ کر تم
سے پیسے یعنی ان تیروں کی اجرت بھی نہیں لوں گا۔ بس جب تم شیر کو ہلاک کردو اور چودھری
تمہیں انعام کے پیسے پانچ ہزار اور ایک گائیں، بکری اور اونٹ انعام دے تو مجھے گائیں دے
دینا۔ گائے کا تازہ دودھ روز پینے کی خواہش ہوتی ہے"۔

ریمو کی طرح دینا لوہار بھی لالچی نکلا۔ اس کی مشکل آسان ہو گئی اور دینا لوہار نے
جیسے ہو چاہتا تھا بالکل ویسے ہی تیر ایک دن کی محنت و مشقت کے بعد بنا دیئے۔ دونوں بہت خو
ش تھے۔ دینا لوہار نے ایک بار پھر ریمو کو وعدہ یاد دلایا۔

"دیکھو ریمو بھائی! تمہاری خاطر پورا دن محنت مزدوری کر کے تمہاری پسند کے
تیر تیار کئے ہیں اور للو کو شہر بھیج کر زہر منگوا کر اس میں بجھائے ہیں۔ بس تم اپنا وعدہ مت بھولنا۔
انعام کی رقم ملتے ہی دونوں گائیں مجھے دے دینا"۔

ریمو نے تیر لے کر وعدہ پکا کیا اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جتنی دیر
میں رات کا اندھیرا پھیلا۔ اتنی دیر میں ریمو نے اپنی تمام تر تیاری مکمل کر لی تھی۔ آج کی رات



ں کی رات تھی۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی
لا دے رہا تھا۔ ریمو بہت جلد ایک درخت پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ ابھی اسے شیر کا
ار کرتے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ قریب ہی سے اس نے شیر کے دھاڑنے کی آواز سنی۔ وہ
تا ہو کر بیٹھ گیا اور کمان کا رخ شیر کی آواز کی سمت کر لیا۔ شیر کے دھاڑنے کی آواز قریب
ہ قریب تر ہوتی جا رہی تھی اور ریمو کی کمان میں تیر کھنچتا ہی جا رہا تھا۔ شیر کی چمک دار
میں دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ یہ دو انگارے نہیں ہیں بلکہ شیر کی خونخوار آنکھیں ہیں۔ پہلے
ل پر خوف طاری ہوا کہ کہیں شیر کو پتا نہ چل جائے کہ میں یہاں چھپا ہوا ہوں اور وہ خود شکار
نے سے پہلے مجھے ہی شکار کر لے۔ ایک سرد لہر اس کے جسم و جاں میں سرایت کر گئی لیکن
رے ہی لمحے اسے خیال آیا کہ بلی کو شیر کی خالہ کیوں کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے شیر کو
ت پر چڑھنا نہیں سکھایا۔ اس لئے اسے یاد آ گیا کہ شیر درخت پر نہیں چڑھ سکتا۔ ریمو نے
، عقل مندی کا کام کیا تھا۔ وہ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے ساتھ لایا تھا تاکہ شیر کے
ے ڈال دے اور شیر جیسے ہی گوشت کھانے میں مگن ہو وہ اس پر تیروں کی بارش کر دے۔ ریمو
ایک گوشت کا ٹکڑا اس کی طرف اچھالا۔ گوشت جیسے ہی اس کی طرف گرا اس نے جھٹ
ت کے ٹکڑے کو جھپٹ لیا۔ لیکن دور لے جا کر کھانے لگا۔ وہ گوشت کھا کر پھر درخت
قریب آ گیا مجبوراً ریمو کو گوشت کا دوسرا ٹکڑا ڈالنا پڑا۔ شیر انتہائی چالاک تھا اس بار بھی وہ
ت کا ٹکڑا لے کر دور ہو گیا اور مزے مزے سے کھانے لگا۔ ریمو مجبور تھا۔ کیونکہ شیر اس کی
سے دور تھا اور اندھیرا بہت زیادہ تھا وہ تیر چلاتا اور نشانے پر لگ بھی جاتا تو شیر کو کچھ نقصان
تا۔ یہی وجہ تھی کہ ریمو نے ابھی تک تیر نہ چلایا تھا۔ یہ آخری ٹکڑا تھا۔ اس بار ریمو نے اس
ی گوشت کے ٹکڑے کو شیر کی مخالف سمت میں پھینکا۔ شیر نے جیسے ہی ٹکڑا اٹھایا اور دور
نے کے لئے اس درخت کے پاس سے گزرا جس پر ریمو بیٹھا تھا۔ موقع اچھا تھا ریمو نے
تیر کھینچ کر شیر کی کمر کا نشانہ لیا۔ نشانہ بالکل ٹھیک لگا تھا۔ شیر تلملا اٹھا لیکن کہتے ہیں کہ زخمی

شیر اور خطرناک ہو جاتا ہے۔ تیر کھا کر شیر ریمو کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اس پر جھپٹنے کے
درخت کی طرف بڑھا لیکن اسی اثناء میں ریمو نے دوسرا تیر داغ دیا۔ اس بار تیر اس کی گر
میں لگا تھا۔ شیر غصے میں دھاڑنے لگا۔ تیسرا تیر کھا کر وہ زمین پر لیٹ گیا۔ کیونکہ تیروں کو
میں بجھایا گیا تھا۔ شاید زہر نے اثر دکھانا شروع کر دیا تھا اور دوسری طرف تیروں کے زخم
تھے۔ جن سے کافی خون بہہ گیا تھا۔ جب کافی دیر کے بعد بھی شیر نے حرکت نہیں کی تو ر
ڈرتے ڈرتے درخت سے نیچے اترا اور سب سے پہلے اس نے ایک رسی شیر کے گلے
باندھ دی تاکہ وہ اسے رسی کے ذریعے قابو کر سکے اور کھینچتا ہوا گاؤں میں لے جائے۔
باندھنے کے بعد ریمو نے اپنا سامان سمیٹا اور تیر نکالنے لگا۔ دو تیر تو آرام سے نکل گئے کی
زیادہ اندر تک شیر کی کھال میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ تیسرا تیر بدن کے گوشت میں گو
تک پیوست ہو چکا تھا اور شاید اسی تیر کے زہر کا اثر ہی اس پر ہونے لگا تھا۔ بہت زور لگا کر
کو نکالا تو بے حد تکلیف کے احساس نے شیر کو مردہ جسم میں جان ڈال دی، وہ بری طرح ج
کر اٹھا اور اندھا دھند بھاگنے لگا۔ ریمو بہت دور جا کر گرا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اب شیر ا
جائے گا۔ لیکن خدا کا شکر کہ شیر کو اپنی جان بچانے کی سوجھی اور وہ سیدھا جنگل کے اندر بھا
گیا۔ ریمو سر جھکا کر ناکام و نامراد گھر لوٹ آیا۔

صبح کاذب ہوئی تھی۔ ابھی پو پھٹنے میں یعنی فجر کا وقت ہونے میں کچھ دیر
تھی۔ شیر بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ وہ جھنجھلاتا ہوا پھر رہا تھا۔ اسے اپنے قاتل کی تلاش تھ
پھر زہر کے اثر سے وہ پاگل سا ہو گیا تھا اس کا منہ جدھر کو اٹھتا وہ دوڑا چلا جاتا۔ اسی پاگل
میں وہ گاؤں میں داخل ہو گیا۔ ابھی تک گاؤں کا کوئی فرد نیند سے بیدار نہیں ہوا تھا۔ سب
پہلے شیر کریمو کمہار کے گھر میں دوڑا اور صحن میں داخل ہوا وہ اس جگہ آ گیا جہاں کمہار نے چا
پر مٹی کے برتن بنا کر رکھے ہوئے تھے۔ آج رات بھی کریمو کمہار نے کچھ برتن بنائے تھے
ان کی مٹی خشک ہونے کے لئے چھوڑ دیئے تھے۔ شیر ان برتنوں کو سونگھنے لگا۔ لیکن جلد با



واپس پلٹا تو اس کی گردن کی رسی اس ڈنڈے میں پھنس گئی جو کمہار نے چاک کے پاس
ڑی ہوئی تھی۔ کیونکہ دھوپ سے بچنے کے لئے کریمو اس پر چادر ٹانگ لیتا تھا۔ جس سے
پر سایہ ہو جاتا تھا اور وہ دھوپ کی جھلسا دینے والی شدت سے محفوظ رہتا تھا۔ شیر کی رسی پر
کا پڑا تو وہ بوکھلا گیا۔ کیونکہ آج تک کسی نے شیر کی گردن میں کتے کی طرح رسی نہیں باندھی
ی۔ یہ تو ریمو تھا جو بے ہوش شیر کی گردن میں رسی باندھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ شیر نے
لاہٹ میں پیچھے کی جانب کر کاٹا تو اس میں بل پڑ گیا۔ شیر گھبراتے ہوئے ادھر اُدھر
نے کی کوشش کرنے لگا اور وہ اپنی گھبراہٹ کی وجہ سے پھنس گیا۔ رسی لکڑی کے گرد اس
رح لپٹ گئی تھی کہ جیسے کسی نے شیر کو جان بوجھ کر باندھا ہو۔ اب تو شیر گردن کو زور زور سے
لانے لگا اور اچھلنے کودنے لگا۔ یہ آواز سن کر کریمو کی بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کریمو کو
یدار کیا۔

"کریمو دیکھو باہر کوئی چور معلوم ہوتا ہے۔ کافی دیر سے کچھ چوری کرنے کی
وشش کر رہا ہے"۔ بیوی کی بات سن کر وہ یوں اچھلا جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ دونوں میاں
یوی نے باہر آ کر دیکھا تو شیر زخمی حالت میں ان کے صحن میں بندھا تھا۔ اس کی بیوی بہت
یران و پریشان ہوئی کہ کوئی دشمن ان کے صحن میں شیر کو باندھ گیا ہے تاکہ ہم دونوں میاں
یوی اس ظالم شیر کی خوراک بن جائیں۔ "نجانے کس کم بخت نے ہم سے یہ دشمنی نکالی
ہے"۔

بیوی کی جلی کٹی سن کر کریمو نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اندر سے دو
ے بڑے ڈنڈے لے آیا اور بولا۔ "چپ چاپ دور دور سے شیر کی کمر پر ڈنڈے برساتی جا
اور میں اس کے سر پر وار کرتا ہوں"۔

کریمو کی بات اس کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ اس لئے دونوں نے ڈنڈوں سے وار
کر کے اسے ادھ موا کر دیا۔ شاید وہ مر چکا تھا۔ کیونکہ تیروں سے زخمی تو پہلے ہی ہو چکا تھا اور

تیروں کا زہر اس کے جسم میں اتر چکا تھا جو اثر انداز پوری طرح ہو چکا تھا۔ اگر کریمو اور اس بیوی اسے ڈنڈوں سے نہ بھی مارتے تو وہ دو گھنٹوں کے اندر اندر زہر کے اثر سے مر جاتا۔ لیکا اب تو سہرا کریمو کے سر جانا تھا۔ کیونکہ در حقیقت اس نے ہی شیر کا شکار کیا تھا۔ انعام کا خیا آتے ہی کریمو پر اداسی چھا گئی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بڑے لوگ اس غریب کی دال نہیں گا دیں گے۔ جھوٹی گواہیاں دلوا کر اسے جھوٹا ثابت کر دیں گے اور انعام خود لے اڑیں گے کریمو کی بیوی بہت ذہین عورت تھی اور وہ کریمو کی اداسی کو بھانپ گئی۔ کریمو نے بتایا تو اس نے ایک ترکیب کریمو کے کان میں بتائی جس سے کوئی شخص بھی اسے جھٹلا نہیں سکتا تھا او چودھری کا انعام اسے ہی ملنا تھا۔ ترکیب سن کر کریمو کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور اس کی آنکھوں میں روشنی چمکنے لگی۔ اس نے ترکیب پر عمل کیا اور اندر سے قینچی لے آیا۔ کچھ دیر شیر پر عمل کرنے کے بعد وہ شیر کو ریڑھی پر لاد کر گاؤں کے بیچوں بیچ پھینک آیا۔ خدا کا شکر ہے کہ کسی نے اسے شیر کی لاش کو پھینکتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

صبح فجر کے وقت دو چار نمازی اٹھے تو ان کی نظر شیر پر پڑی۔ انہوں نے شور مچا کر خوشی کا اظہار کیا کہ گاؤں والوں خونخوار شیر مر چکا ہے۔ یہ آواز سنی تو گاؤں والے جوق در جوق آنے لگے اور شیر کی لاش دیکھنے لگے۔ کافی لوگ جمع ہو گئے تو ایک شخص نے کہا۔

”بھئی یہ تو سب دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں کہ شیر مر چکا ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ اس شیر کو کس جوان اور بہادر شخص نے مارا ہے۔ کون مائی کا جایا ہے جس نے اپنی جان پر ہتھیلی پر رکھ کر یہ مہم سر کی ہے؟“

اس شخص کی بات سن کر سبھی ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اتنے میں نظام الدین آنکھیں ملتا ہوا آیا۔ اس کے ذہن میں کوئی سازش چل رہی تھی۔ اس نے سوال سن لیا تھا۔ ”ارے بھئی نظام الدین جیسے جری نوجوان کے ہوتے ہوئے کون اس کو مار سکتا ہے۔ اس دن تو تم لوگوں نے میرا مذاق اڑایا۔ جب میں نے کہا تھا کہ شیر میرا جال توڑ کر بھاگ گیا ہے تو تم



نے اسے جھوٹ سمجھا اور کہا کہ میں انعام کے لالچ میں اندھا ہو گیا ہوں۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لو کہ شیر مرا پڑا ہے“۔

گاؤں والوں نے نظام الدین کی بہت تعریف کی اور کہا کہ چودھری صاحب سے تمہیں ہی انعام دلوائیں گے۔ دینا لوہار اچھلتا کودتا آگے بڑھا اور خوشی سے پر ہو کر نظام الدین سے بغل گیر ہو گیا۔ دینا لوہار نے اسے زور سے بھینچتے ہوئے کہا۔ ”بھئی وعدہ مت بھولنا۔ دونوں گائیں مجھے دے دینا“۔ کان میں دینا لوہار کی سرگوشی سن کر اس نے وقتی طور پر ہاں کی لیکن اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا کہ دینا لوہار اس سے گائیں کیوں مانگ رہا ہے۔

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ ریمو آستین اوپر چڑھاتا ہوا پنڈال میں حاضر ہوا۔ ”گاؤں والوں اب تو خوش ہو۔ میں نے شیر کا شکار کر کے تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو پناہ میں لے لیا ہے۔ لیکن بھائیوں ایک بات بتا دوں۔ بڑی محنت اور جان جوکھوں کے بعد اس کو مارا ہے“۔

نظام الدین ماہی گیر اور دینا لوہار بغلیں جھانکنے لگے اور گاؤں والے ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر ریمو کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ریمو نے بتایا۔ ”شیر کو اس نے مارا ہے جس کا ثبوت تیروں کے نشان ہیں جو تیر میں نے شیر پر چلائے تھے اور اس بات کی گواہی دینا لوہار بھی دے گا کہ یہ تیر اسی نے بنا کر دیئے تھے“۔

تب دینا لوہار کو شرمندگی کا احساس ہوا کہ وہ فرط جذبات میں نظام الدین سے لپٹ گیا تھا اور اس سے گائیں کا مطالبہ بھی کر بیٹھا تھا جبکہ اس نے وعدہ تو ریمو سے کیا تھا۔ اس ندامت سے سر جھکا لیا تھا لیکن اگلے ہی لمحے وہ دوڑ کر ریمو سے چمٹ گیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”بھئی دونوں گائیں م جھے دینا اپنے وعدے کے مطابق“۔

ریمو نے جان چھڑانے کے لئے ہاں کہہ دی۔ اس بار گاؤں والے ریمو کی

تعریف کرنے لگے۔ وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا اور دن کافی چڑھ چکا تھا۔

یہ خبر چودھری کو پہنچی تو وہ ایک اونٹ، دو گائیں، چار بکریاں اور پانچ ہزار روپے لے کر اس جگہ پہنچ گئے۔ دیکھا تو واقعی شیر مردہ حالت میں پڑا تھا۔ لیکن چودھری صاحب کے لئے حیران کن بات یہ تھی کہ شیر کو مارنے کا دعویٰ کرنے والے دو شخص تھے۔ وہ دونوں ہی کہہ رہے تھے کہ ہم نے مارا ہے۔ چودھری صاحب نے وضاحت چاہی کہ اگر تم دونوں نے مارا ہے مل کر تو دونوں انعام کی رقم اور مویشی آدھے آدھے بانٹ لو لیکن لالچ بری بلا ہوتی ہے۔ دونوں جھوٹے تھے اور پورا انعام ہڑپ کر جانا چاہتے تھے۔ دونوں بضد رہے کہ اس اکیلے نے شیر کو مارا ہے۔ کہانی الجھ گئی ہے اور فیصلہ مشکل ہو گیا۔

گاؤں کی مسجد کے پیش امام کو بلایا گیا اور فیصلہ کرنے کو کہا گیا۔ پیش امام صاحب بہت دین دار، ایمان دار اور ذہین شخص تھے۔ انہوں نے شیر کو بغور مشاہدہ کیا تو ملاحظہ کیا کہ شیر کے چاروں پنجوں کے ناخن کاٹے ہوئے ہیں۔ پیش امام صاحب نے چودھری صاحب کے کان میں یہ بات بتائی کہ شیر کے پنجوں کے ناخن کاٹے گئے ہیں آپ اعلان کر دیں کہ جس کے پاس شیر کے پنجوں کے ناخن ہیں وہی شیر کا قاتل ہے۔ اسی نے شیر کو ہلاک کیا ہے اور وہی انعام کی رقم اور مویشیوں کا حق دار ہے۔ یہ اعلان سن کر گاؤں والوں کی حیرت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور نظام الدین اور رمو آنکھ بچا کر بھاگ نکلے۔ کریمو کی بیوی نے کریمو کو اشارہ کیا کہ وہ شیر کے پنجوں سے کاٹے گئے ناخن چودھری صاحب کے سامنے پیش کر دے۔ کریمو نے مودبانہ عرض کی۔

"چودھری صاحب! اس شیر کو ہم دونوں میاں بیوی نے ہلاک کیا ہے۔ یہ ترکیب میری بیوی نے بتائی تھی کہ اس کے ناخن کاٹ کر اپنے پاس رکھ لوں، انہیں لوگوں کے ڈر سے کیونکہ یہ انعام کے لالچ میں جھوٹے کو سچا اور سچے کو جھوٹا قرار دے دیتے ہیں۔ یہ لیجئے ناخن۔۔۔" ناخن دیکھ کر پیش امام نے اشارہ کیا تو چودھری صاحب نے اسے شاباش دیتے



ہوئے انعام کی تمام چیزیں اس کے حوالے کر دیں۔ یوں قدرت نے بیٹھے بٹھائے انہیں عزت اور دولت دونوں نعمتوں سے نواز دیا۔

☆☆☆

## مہم جو

**عبدالرحیم** صاحب محکمہ جنگلات میں آفیسر کے عہدے پر کام کرتے تھے۔ بہت تجربہ کار، محنتی اور ایمان دار آفیسر مانے جاتے تھے۔ کیونکہ اکثر جنگلات سے لکڑیاں چوری کی جاتی تھیں اور یہ کام محکمہ جنگلات کے آفیسر کی مرضی کے بنا ممکن نہیں تھا۔ لکڑی چوروں کے بڑے بڑے گروہ کام کرتے تھے جو بہت منظم اور اثر و رسوخ والے ہوتے تھے۔ جس جنگل سے لکڑی چوری کی شکایات زیادہ وصول ہوتیں اور وہاں آفیسر لکڑی چوری کرنے والوں کو پکڑنے میں ناکام رہتا یا وہ آفیسر چوروں سے ملا ہوا پایا جاتا تو اس جگہ جناب عبدالرحیم کو تبادلہ کر کے اس کی جگہ بھیج دیا جاتا۔ عبدالرحیم صاحب کو اس جگہ تبادلہ ہوئے ابھی دو ماہ گزرے تھے۔ وہ پوری لگن سے ان چوروں کی کھوج میں لگے ہوئے تھے جو لکڑیاں راتوں رات کاٹ کر پہاڑ سے نیچے لڑھکا دیتے تھے اور پورے پورے درخت آبشار سے بننے والی نہر میں جا گرتے اور بہتے ہوئے ان چوروں کے ٹھکانے پر چلے جاتے۔ جہاں سے وہ با آسانی ان چوری کئے ہوئے درختوں کو پانی سے باہر نکال لیتے اور کاٹ کر ہزاروں روپوں میں بیچ دیتے۔ یہ سلسلہ سالوں سے جاری رہتا تھا۔ ان روپوں میں سے وہ چور محکمہ جنگلات کے آفیسر کا حصہ بھی رکھتے۔ لیکن جس جنگل میں عبدالرحیم کی ڈیوٹی ہوتی اس جنگل سے چوروں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ کیونکہ عبدالرحیم صاحب نہ تو رشوت لیتے تھے اور نہ ہی بے ایمان پر آمادہ ہوتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی بیوی اور تینوں بیٹوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہے

تھے۔ پپو، بلو اور گڈو ان کے تین ننھے منے بچے تھے۔ بہت ہی خوبصورت، پیارے پیارے۔ انتہائی ذہین اور ہوشیار بچے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل کود میں بھی مگن رہتے تھے اور کام کاج چاہے جنگل میں ابو کے ساتھ ہو یا گھر میں امی کے ساتھ۔ دونوں کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ بچے تھے۔ شرارتیں بھی کرتے تھے لیکن ان کی شرارت سے کسی کو کوئی شکایت یا نقصان نہیں تھا۔ بلکہ ماں باپ ان کی شرارتوں سے محظوظ ہوتے تھے اور ان کی بھولی بھالی اداؤں پر ہنستے رہتے تھے۔ پپو، بلو اور گڈو کی عمریں بالترتیب گیارہ، نو اور سات سال کی تھیں۔ پپو بڑا بھائی ہونے کے ناتے ان دونوں کا خیال بھی رکھتا تھا۔

آج اتوار کا دن تھا۔ موسم نہایت خوشگوار اور دل لبھانے والا تھا۔ پپو کے والدین صبح سویرے بیدار ہو جاتے تھے۔ نماز ادا کرنے کے بعد ان کے والد ورزش کے لئے باہر کا نظارہ کرتے اور والدہ کچھ دیر کے لئے تلاوت قرآن پاک کرتی تھیں۔ جس سے ان کے گھر پر رحمتوں کا نزول رہتا تھا۔ تلاوت قرآن پاک سے فارغ ہو کر وہ سب کے لئے ناشتہ بنانے میں مصروف ہو جاتیں۔ اتنے میں ان کے ابو آ کر تینوں بچوں کو جگا دیتے۔ تینوں بچے ہنسی خوشی اٹھتے اور ہاتھ منہ دھو کر ناشتے کے لئے تیار ہو جاتے۔ سب ناشتہ کر کے اپنے اپنے کام میں مگن ہو جاتے اور بچے کبھی پہلے کھیل کو وقت دیتے اور بعد میں پڑھائی کرتے اور کبھی پہلے پڑھائی کا فرض انجام دیتے اور بعد میں کھیلتے تھے۔ یہ بات بچوں کے موڈ پر منحصر ہوتی تھی۔ آج چونکہ اتوار تھا اور چھٹی کا دن تھا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ان کی امی نے تینوں بچوں کو بلا کر کہا۔ "بچوں آج میں شہر جا رہی ہوں۔ کچھ سامان کھانے پینے کا لینے کے لئے اور کچھ ضروریات زندگی کی اشیاء خریدنے کے لئے اور آپ سب کے لئے بھی کپڑے اور کھلونے خریدنے ہیں۔ دو چار چیزیں آپ کے ابو کی لانی ہیں۔ آج آپ کے پاس آپ کے ابو رہیں گے۔ آپ خود بھی اپنا دھیان رکھنا۔ گھر سے کہیں دور نہ جانا۔ کبھی آپ کو اور آپ کے ابو کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے"۔ بچوں نے والدہ کے حکم کی فرماں برداری میں سر جھکا دیا اور



والدہ کو یقین دلایا کہ وہ آرام سے رہیں گے اور کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے جس سے کوئی مشکل آن کھڑی ہو۔ امی جان نے تینوں کو شاباشی دی اور عبدالرحیم صاحب کی کار ڈرائیو کرتی ہوئی شہر کی جانب روانہ ہو گئیں۔

امی کے جانے کے بعد پپو نے مشورہ دیا کہ پہلے پڑھائی لکھائی کا کام مکمل کر لیتے ہیں تاکہ کہیں کھیل کھیل میں وقت نہ ملے اور پڑھائی رہ جائے اور امی ناراض ہو جائیں۔ بلو اور گڈو کو مشورہ پسند آیا۔ اس لئے انہوں نے اپنے اپنے بستے لئے اور ہوم ورک کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ ایک گھنٹہ گزر جانے پر ان تینوں کا ہوم ورک مکمل ہو گیا۔ ابھی وہ اپنے بستے میں کتابیں اور کاپیاں رکھ ہی رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ "بیٹا میں عبدالرحیم صاحب محکمہ جنگلات کے آفیسر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ان کو بلا کر میری بات کروا دیں۔ ذرا جلدی سے"۔ بلو نے او۔ کے کہا اور ٹیلی فون کا ریسیور رکھ کر ابو کو بلا لایا۔ ابو نے کافی دیر اس شخص سے بات کی اور ٹیلی فون سننے کے بعد پریشانی دکھائی دینے لگے۔ گڈو نے پوچھا۔

"ابو جان کیا بات ہے؟ یہ کس کا فون تھا؟ جسے سن کر آپ سوچ میں مبتلا ہو گئے ہیں۔؟"

"نہیں بیٹا کوئی ایسی بات نہیں ہے"۔ ان کے ابو نے راز داری سے کام لیا۔ اسی اثناء میں پپو اور بلو بھی ان کے قریب آ چکے تھے۔

"بتایئے نا ابو جان کس کا فون تھا"۔ اس بار پپو نے اصرار کیا۔

"بیٹا جنگلات کی لکڑی چوری کی جا رہی ہے۔ کسی مہربان نے مجھے فون پر یہ خبر دی ہے کہ وہ لوگ بیسیوں کی تعداد میں آئے ہیں اور بڑے بڑے آرے ان کے ساتھ ہیں۔ وہ بہت تیز رفتاری اور عجلت میں یہ کام کر رہے ہیں۔ پس وہ گروہ ہے جو اس جنگل سے سب سے زیادہ لکڑی چوری کرتا ہے۔ مجھ سے پہلے یہاں تعینات آفیسران سے ملا ہوا تھا۔ تو یہ لوگ با آسانی یہ کام کرتے تھے لیکن اس آفیسر کو اسی جرم میں سزا کے طور پر تبادلہ کر دیا گیا ہے۔ اب

یہ لوگ ذرا احتیاط سے کام کر رہے ہیں۔ وقت بدل بدل کر۔ کبھی رات کو لکڑی چوری کرتے ہیں اور کبھی دن کو۔ اس لئے آپ کو کچھ دیر کے لئے اکیلا رہنا پڑے گا۔ میں ایک یا دو گھنٹوں میں جنگلات کا دورہ کر کے واپس آجاؤں گا۔ چوری کی روک تھام کرنا میرا فرض ہے۔ مجھے خصوصاً اس کام کے لئے یہاں بھیجا گیا ہے۔"

"ابو جان آپ فکر مند نہ ہوں۔ ہم اپنی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ آپ اپنا فرض ادا کریں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں"۔ بلو نے سب بھائیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں بیٹا! تم سب بھائیوں کا خیال رکھنا اور گھر میں ہی رہنا۔ میں جلد لوٹ آنے کی کوشش کروں گا"۔ عبدالرحیم صاحب ان کو سمجھا کر جیپ میں سوار ہوئے اور جنگلات کا رخ کیا۔

ابو کے جانے کے بعد پپو نے دروازہ بند کیا اور ٹی وی آن کر کے کارٹون دیکھنے لگا۔ بلو نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ گڈو کو کارٹون دیکھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس لئے وہ اس گیند سے کھیلنے لگا جو اس کی امی پچھلے مہینے گڈو کے لئے شہر سے لے کر آئی تھیں۔ اس گیند میں ایک خوبی کی بات تھی جب اس کو ہلکے سے زمین پر پھینکا جاتا تھا تو یہ بہت زور سے اوپر کی طرف آتی تھی اور بہت دیر تک اچھلتی رہتی تھی۔ یہ گیند بالکل شفاف اور عمدہ ربڑ سے بنی ہوئی تھی۔ اس گیند کو سم سم بال بھی کہتے تھے۔ گڈو اوپر کمرے میں اس بال کو زمین پر زور سے اچھالتا اور اس کے رکنے تک مزا لیتا۔ پھر اور زور سے اچھالتا۔ یہی اس کا کھیل تھا۔ اس بار گڈو نے زور لگا کر گیند کو بہت طاقت سے زمین سے ٹکرایا تو وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی اور آڑی ترچھی ہو کر زمین اور دیوار سے ٹکراتی ہوئی کھڑکی سے باہر نکل گئی۔ ایک منزل اوپر سے گیند نیچے سیڑھیوں سے ٹکرائی تو اور دور جا گری۔ گڈو کو یہ گیند بہت پسند تھی۔ وہ چپکے چپکے نیچے گیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس کی نظریں اسی جانب لگی ہوئی تھیں۔ جس طرف گیند جا رہی تھی۔ گیند ابھی تک اچھل رہی تھی۔ گڈو اس کی طرف دوڑا لیکن اب گیند اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی وہ گیند کو ہر



حال میں تلاش کرنا چاہتا تھا۔

کافی دیر گزر جانے کے بعد پپو نے بور ہو کر کارٹون بند کر دیئے اور بلو سے پوچھا "دیکھو گڈو اوپر کیا کر رہا ہے"۔ بلو نے اوپر جا کر سارا کمرہ چھان مارا لیکن گڈو نظر نہ آیا۔ اس نے اوپر ہی سے پپو سے کہا "بھائی گڈو یہاں نہیں ہے"۔ دونوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ ابھی تو گڈو اوپر کھیل رہا تھا۔ اس کے کھیلنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی لیکن ذرا دیر میں وہ کہاں چلا گیا۔ پپو کی نظر دروازے پر پڑی جو کھلا ہوا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے دروازہ تو اچھی طرح بند کیا تھا اگر یہ کھلا ہے تو اس کا مطلب یہ ہی ہوا کہ گڈو بغیر بتائے گھر سے باہر چلا گیا ہے۔ بلو نے بھی یاد کر کے کہا۔ "ہاں ہم نے دروازہ بند کیا تھا۔ پپو بھائی جلدی کرو اور گڈو کو تلاش کریں، ورنہ امی یا ابو جان آکر ڈانٹ دیں گے اور ہمیں غیر ذمہ داری کا احساس دلائیں گے"۔

پپو اور بلو دونوں گڈو کو تلاش کرنے نکل پڑے۔ پہلے انہوں نے گھر سے باہر باغیچے میں گڈو کو تلاش کیا لیکن ان کی تلاش بے سود رہی۔ پھر انہوں نے گیراج میں تلاش کیا لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ وقت کم تھا۔ ان کے ابو کے آنے کا وقت ہو چلا تھا اور کسی بھی وقت وہ آسکتے تھے۔ پپو نے بلو کو شمال کی جانب تلاش کرنے کو کہا اور خود جنوب کی سمت میں گڈو کو دیکھنے لگا۔ وہ دس پندرہ قدم چل چل کر ہلکے ہلکے آوازیں بھی دے رہے تھے۔ لیکن ابھی تک ان کو نہ تو گڈو کا کوئی پتہ چلا تھا اور نہ ہی ان کی آواز کے جواب میں کوئی آواز آئی تھی۔ بلو اور پپو بہت زیادہ فکر مند دکھائی دے رہے تھے۔ اس بار بلو کے کہنے پر پپو مشرق کی سمت روانہ ہوا اور بلو خود مغرب کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ وہ دونوں گھبراہٹ میں ادھر ادھر دوڑ رہے تھے لیکن گڈو کا کہیں سراغ نہ مل سکا۔

بلو کو ایک پہاڑی نما ٹیلہ دکھائی دیا۔ اس نے سوچا کیوں نہ اس ٹیلے پر چڑھ کر نظر دوڑائی جائے۔ اونچائی سے بہت دور دور کے مناظر نظر آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں سے

گڈو بھی کہیں دور نظر آجائے۔ وہ دوڑ کر ٹیلے پر چڑھ گیا۔ جب اس نے ٹیلے سے اس طرف دیکھا تو چند مزدوروں کو جنگل میں کام کرتے پایا وہ سب بڑے بڑے آروں سے لکڑیاں کاٹ رہے تھے۔ بڑے بڑے تناور درختوں کے موٹے موٹے تنے کاٹ رہے تھے اور کچھ درخت ان کے پاس کٹے پڑے تھے جو ہرے بھرے تھے اور کاٹ کر گرائے گئے تھے۔ بلو پہلے تو سمجھا کہ یہی مزدور ابو کے ماتحت کام کر رہے ہیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ آج تو اتوار ہے۔ چھٹی ہونے کی وجہ سے کام بند ہیں۔ وہ ایک دم کسی اچانک خیال سے یوں چونکا جیسے اسے بجلی کے کرنٹ کا جھٹکا لگ گیا ہو۔ وہ آن واحد میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ مزدور نہیں ہیں بلکہ وہی لوگ ہیں جو ابو کے جنگلات سے لکڑی چوری کرتے ہیں۔ یہ خیال کرتے ہی بلو نے اپنے آپ کو ذرا سا نیچے جھکا لیا کہ کہیں اس پر ان چوروں کی نظر نہ پڑ جائے۔ وہ کیا کرے اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ الٹے قدموں واپس ہو لیا تا کہ پپو سے مل کر گڈو کے بارے میں بھی پوچھے اور ان چوروں کے بارے میں بھی بتائے۔ بلو دوڑ کر گھر کی جانب آیا۔ لیکن پپو ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ بلو نے گھر کے اندر جا کر دیکھا تو ابھی تک اس کے والدین بھی گھر نہیں پہنچے تھے۔

پپو بھی بہت دور نکل گیا تھا لیکن اسے ابھی تک گڈو کی کوئی خبر نہیں ملی تھی وہ مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا کہ اس کے قدموں کی چاپ کی آواز پر کسی نے اسے پکارا۔ "یہ آواز تو گڈو ہی کی ہے لیکن گڈو ہے کہاں"۔ پپو نے دل میں سوچا اور گھوم کر چاروں طرف دیکھا لیکن گڈو کہیں نظر نہیں آیا۔ اس بار پپو نے گڈو۔۔۔گڈو۔۔۔تم کہاں ہو؟ کہہ کر زور سے پکارا تو کہیں قریب ہی سے آواز آئی۔ "پپو بھائی ادھر آؤ" اس کی آواز کی سمت کا تعین کر کے پپو قدم اٹھاتا رہا۔ بہت جلد وہ اس گڑھے کے قریب پہنچ گیا جس میں گڈو موجود تھا۔ "گڈو تم اس گڑھے میں کیسے گرے ہو"۔ پپو نے زمین پر لیٹ کر اسے اپنا ہاتھ پکڑانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ "بھائی اس میں میری گیند چلی گئی تھی۔ میں اسے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ میرا پاؤں پھسل گیا اور یوں میں اس گڑھے میں گر گیا"۔



"لیکن تم شور کیوں نہیں مچا رہے تھے؟" پپو نے حیرانی سے پوچھا۔ "اس لئے کہیں کوئی جنگلی جانور نہ آجائے۔ میں پتوں کی آواز سنتا تھا تو آہستہ سے آواز دیتا تھا کہ کوئی انسان ہوگا تو میری بات سمجھ کر مجھے بچانے آجائے گا اور جانور ہوگا تو اردو سمجھ نہیں پائے گا"۔ وہ دونوں ہنستے ہوئے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔

"خدا کا شکر ہے گڈو مل گیا"۔ بلو نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اسی اثناء میں انہیں جیپ کی آواز سنائی دی۔ وہ تینوں سمجھ گئے کہ ان کے والد لوٹ آئے ہیں۔ پپو نے چالاکی کرتے ہوئے کہا۔ "گڈو تم فوراً غسل خانے میں جاؤ۔ نہا دھو کر باہر نکلنا کیونکہ تمہارے پورے بدن پر مٹی لگ چکی ہے۔ ابو پوچھیں تو کہہ دینا کہ گرمی محسوس ہو رہی تھی اس لئے نہانے گیا تھا اور ہاں ان کپڑوں کو بھی اندر ہی دھو لینا اور دوسرا لباس پہن کر آنا۔ اتنے میں ابو جان کو باتوں میں لگاتے ہیں"۔ اس لئے گڈو جلدی سے غسل خانے میں داخل ہو گیا۔

عبدالرحیم صاحب واپس آئے تو ان کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات اور زیادہ بڑھ چکے تھے۔ انہوں نے آ کر اپنی سانسوں کو درست کیا۔ شاید تھکن سے ان کی حالت بگڑ چکی تھی یا کوئی اور وجہ تھی۔ پپو نے فریج سے پانی نکال کر اپنے ابو کو دیا۔ اس سے پہلے پپو یا بلو ان سے پریشانی کی وجہ پوچھتا، ان کو کار کی آواز سے محسوس ہوا کہ ان کی امی جان بھی لوٹ آئی ہیں۔ بلو نے باہر جا کر دیکھا تو واقعی ان کی امی کار پارک کر رہی تھیں۔ انہوں نے پپو، بلو اور گڈو کو پکارا۔ "آؤ بچو! سامان زیادہ ہے تھوڑا تھوڑا اٹھا کر اندر لے جاؤ"۔ امی کی ایک آواز پر پپو، بلو اور نہانے سے فارغ ہو کر گڈو بھی باہر چلا آیا تھا۔

سب نے مل کر دوپہر کا کھانا کھایا جو ان کی امی بازار سے لیتی آئی تھیں۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد گفتگو کا آغاز ہوا تو ابو نے بتایا کہ وہ لوگ میرے آنے کی خبر پا کر فرار ہو گئے تھے لیکن میں ان کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ وہ کوئی بہت بڑا گروہ ہے اور ان کے ساتھ کافی لوگ شامل ہیں جن کا اثر و رسوخ زیادہ ہے"۔ عبدالرحیم کی باتیں سن کر ان کی بیوی کی

بہت افسوس ہوا اور سوچنے لگی کہ اچھے اور برے، نیک اور بد ہر جگہ، ہر قوم اور مذہب میں ہوتے ہیں۔ چوری کرنا کتنا بڑا جرم اور گناہ ہے پھر بھی لوگ چوری کر کے خود کو بھی ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہیں۔ یہ لوگ جانتے بھی ہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ اس سے کسی کا حال پوشیدہ نہیں ہے۔ پھر بھی یہ لوگ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں۔ ''آپ فکر مند نہ ہوں اگر مسئلہ الجھا ہوا محسوس کریں تو پولیس کی مدد لیجئے گا''۔ مسز عبدالرحیم نے اپنے شوہر کو دلاسہ دیتے ہوئے مشورہ دیا۔ عبدالرحیم صاحب خاموش رہے۔ امی نے بچوں کو کہا کہ وہ اپنے کمرے میں چلے جائیں۔ تینوں بچے خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے آئے۔ نیند آنا تو دور کی بات ہے انہیں تو چین نہیں آ رہا تھا۔

''بھائی جان! ہم اپنے آپ کو بہت زیادہ ذہین سمجھتے ہیں۔ پڑھائی میں بہت فطین خیال کرتے ہیں۔ اگر ہم نے اس ذہن سے کام لیتے ہوئے اپنے والد کی پریشانی دور نہ کی تو پھر ہمارے ذہین ہونے کا کیا فائدہ ہے۔ بچے بڑے ہو کر والدین کا سہارا بنتے ہیں۔ یہ تو ہوتا آیا ہے لیکن ہم بچپن میں ہی چھوٹے رہ کر والدین کا سہارا بنیں تو ایک نئی مثال قائم ہو گی اور آئندہ یہ ریت چل نکلے گی، ہماری دیکھا دیکھی اور بچے بھی اپنے والدین کو بچپن ہی سے سہارا دینے لگیں گے''۔ بلو نے تقریر کے انداز میں پپو سے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو بلو، ہمیں والد صاحب کو اس پریشانی سے نکالنے کے لئے کچھ سوچنا ہو گا''۔ ''سوچنا نہیں پپو بھائی بلکہ کر دکھانا ہو گا''۔ گڈو نے بڑے بھائی کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ''سوچو ہمیں کیا کرنا ہے؟'' پپو کی بات پر سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے۔ سب اپنے اپنے دماغ اور انداز کے مطابق سوچ رہے تھے۔

''بھائی ایک عمدہ ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے کہو تو بتاؤں؟'' بلو نے آنکھوں کو نچا کر کہا۔ ''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔منے کیوں نہیں بتاؤ۔ قابل عمل ہوئی تو ضرور عمل کیا جائے گا''۔ پپو نے توجہ بلو کی طرف کرتے مبذول کرتے ہوئے پوچھا۔ ''بھائی ہم نے سنا ہے کہ



جنگل میں جنگلی جانور ہوتے ہیں۔ خصوصاً بھیڑیا ، جو جنگل میں سے گزرنے والے لوگوں کو کھا جاتا ہے۔ ان لوگوں میں مرد ہوں یا عورتیں بچے ہوں، یا بوڑھے، وہ کسی کو نہیں چھوڑتا۔ کیوں نہ ہم یہ افواہ پورے جنگل میں بلکہ جنگل سے باہر اطراف میں پھیلا دیں کہ اس جنگل میں ایک آدم خور بھیڑیا آ کر رہنے لگا ہے جو راتوں کو زیادہ اور دن کو کم انسانوں پر حملہ آور ہوتا ہے اور ان کے جسم کا گوشت چند سیکنڈوں میں کھا جاتا ہے بلکہ ان کی ہڈیاں بھی چبا جاتا ہے۔'' گڈو کو یہ افواہ پسند آئی۔ ''ہاں بھائی! اس طرح چور نہ تو دن میں اور نہ ہی رات کو جنگل میں داخل ہوں گے اور اس طرح جنگل سے لکڑی چوری نہیں ہو گی۔ تب ہمارے والد کی پریشانی دور ہو جائے گی۔''

گڈو نے بھی تائید کی تو پپو کو سوچنا پڑا۔ ''لیکن بچوں افواہ پھیلانے سے کام تھوڑا ہی ہو گا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہلکی پھلکی سی واردات بھی ہو۔'' پپو نے حقائق کو نظر میں رکھتے ہوئے بات کی۔ ''یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اس ہلکی پھلکی واردات کا ذمہ لیتا ہوں۔'' بلو نے ذمہ داری سے کہا۔ ''لیکن بلو تم کرو گے کیا؟'' گڈو نے آنکھیں پھاڑ کر بلو کی طرف دیکھا۔

''گڈو میں کوئی اصل واردات تھوڑا ہی کروں گا۔ میں نے تمہیں کل بتایا تھا کہ ہمارے پڑوس میں میرا کلاس فیلو رہتا ہے۔ کل اس کا ہاتھ مشین میں آ گیا تھا جو بہت بری طرح زخمی ہوا ہے لیکن ان لوگوں نے ابھی تک کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ میں اپنے کلاس فیلو نظام الدین کو مصلحت کی خاطر جھوٹ بولنے پر تیار کر لوں گا کہ وہ تمام لوگوں کو یہ بتائے کہ گزشتہ روز وہ جنگل کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اچانک جنگل کے اندر سے ایک بھیڑیا نمودار ہوا اور اس حملہ آور ہوا۔ بھیڑیئے نے اس کا ہاتھ چبا ڈالا۔ یہ تو خدا کا شکر ہے کہ وہ راہ گیر آ رہے تھے کہ انہوں نے لاٹھیوں کے وار کر کے اسے مار بھگایا۔ تب کہیں جا کے اس کی جان بچی ورنہ بھیڑیا اس کو کچا چبا جاتا۔ یوں ہلکی پھلکی واردات کے موضوع پر بحث بن جائے گی اور لوگوں کے

ذہن میں بھیڑیے کا تصور جاگ اٹھے گا"۔ بلو نے تفصیل سے بتایا۔ "کیا اس کے والدین
نظام الدین کو جھوٹ بولنے اور یہ سب کچھ کرنے کی اجازت دیں گے اور کیا اس کے والدین
اس جھوٹ میں شامل ہو جائیں گے"۔ پپو نے یہ ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ "ہاں بھائی میں
کہوں گا کہ نظام الدین کی تصویر اس خبر کے ساتھ اخبار میں شائع ہو گی تو وہ لوگ شہرت کے
لالچ میں مان جائیں گے"۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے بلو۔ لیکن یہ بتاؤ اس افواہ کے بعد ہمیں کیا کرنا ہوگا؟" پ
نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب چاہا اور یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس
ذہن بلو کے ذہن سے کتنی ہم آہنگی رکھتا ہے۔ "بھائی اس افواہ اور واردات کے بعد ہم کچھ
راتوں کو والدین سے چپکے چپکے جنگل میں جائیں گے۔ ان چوروں کو تلاش کریں گے اور ان
بھیڑیے، چیتے اور کالی خونخوار بلیوں سے ڈرائیں گے۔ تم نے وہ کمبل تو دیکھیں ہیں نا جو
موسم سرما میں اوڑھ کر سوتے ہیں۔ کالے رنگ کے ان کمبلوں میں چھپ کر اور عجیب وغریب
حرکتوں کے ذریعے ان چوروں پر خوف طاری کریں گے اور ڈراؤنی اور خوفناک آوازیں نکال
کر انہیں بھاگ جانے پر مجبور کر دیں گے"۔ بلو نے پورا مقصد ان کے سامنے بیان کر دیا۔ "
بھائی کتنا مزا آئے گا، رات کا وقت ہوگا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوگا۔ اس قدر اندھیرا ہوگا کہ
ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے گا۔ خوف کی لہریں جسم میں دوڑ رہی ہوں گی۔ عجیب ہولناک
منظر ہوگا۔ مجھے تو بہت مستی سوجھے گی"۔ گڈو نے مزے لے لے کر باتیں بتائیں۔ چلو ٹھیک
ہے آج سے اس منصوبے پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

کل دوپہر تک یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل چکی تھی کہ نظام الدین
اسکول سے گھر آ رہا تھا کہ جب وہ جنگل کے پاس سے گزرا تو ایک بھیڑیا درخت کی اوٹ سے
نمودار ہوا اور اس پر حملہ کر کے ہاتھ چبا گیا۔ بہ مشکل دو راہ گیروں نے لاٹھیوں سے وار کر کے
بھیڑیے کو بھگایا اور نظام الدین کو بچایا۔ واقعی بلو نے اپنا کام ہوشیاری سے کیا تھا۔ شام کے



اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی تو زیر بحث آ گئی۔ ان کے ابو نے بھی انہیں جنگل میں اکیلا جانے سے
منع کر دیا۔ وہ تینوں پہلے قدم میں کامیاب ہوئے تو آج رات انہیں دوسرا قدم اٹھانا تھا۔
تینوں بھائیوں نے مچان پر سے تین کمبل اتار لیے اور ان کو جھاڑ کر تیار کر لیا۔ رات ہوئی اور ہر
طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ پپو نے یقین کر لیا کہ اس کے والدین سو چکے ہیں تو وہ تینوں تیار ہو
کر جنگل میں نکل کھڑے ہوئے۔ ایک خوف کی لہر ان کے جسموں میں سرایت کر گئی کیونکہ ہر
طرف ہو کا عالم تھا۔ لیکن انہیں اپنی جان پر کھیل کر بھی اپنے والدین کی پریشانی دور کرنا
تھا۔ "بھائی جس دن گڈو کھو گیا تھا اور ہم تلاش کر رہے تھے۔ اس دن میں گڈو کو تلاش کرتا
ہوا اس طرف جا نکلا تھا۔ وہاں ایک ٹیلے پر چڑھا تھا کہ میری نظر ان چوروں پر پڑی۔ آج کل
وہ چور اس طرف سے لکڑی چوری کر رہے ہیں۔ چلو اس طرف چلتے ہیں"۔ بلو نے ٹیلے کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ان تینوں نے ادھر کا رخ کیا اور بہت جلد ان تک پہنچ گئے۔
انہوں نے ٹارچ اور دیگر سامان جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے، زمین پر رکھا اور کمبلوں کو اوڑھ لیا۔
یہی وہ لکڑی چور تھے۔ انہیں لوگوں کو بچوں نے ڈرانا تھا۔ چنانچہ پپو نے بہت زور سے
اوں۔۔۔ اوں، اوں۔۔۔ اوں کی آواز بلند کی۔ آواز سنتے ہی آرا چلنے کی آواز بند ہو گئی۔ اس کا
مطلب تھا کہ چور سمجھ گئے تھے کہ یہ کسی بھیڑیے کی آواز ہے۔ ادھر پپو آواز پر آواز بلند کر رہا تھا
اور ادھر گڈو زمین پر پڑے ہوئے خشک زرد اور سوکھے پتوں پر تیز تیز دوڑ رہا تھا۔ رات کے
خاموش ماحول اور گہرے سناٹے میں یہ آواز بھی کسی شور طوفان سے کم نہ تھی۔ "باس لگتا ہے کہ
بھیڑیے نے ہمیں دیکھ لیا ہے"۔ ایک مزدور نے پریشان ہو کر کہا۔ "ہاں! مجھے بھی محسوس ہو رہا
ہے کیونکہ کل ہی اس نے جنگل سے گزرنے والے بچے کا ہاتھ چبایا ہے"۔ ابھی وہ باتیں کر ہی
رہے تھے کہ پپو اور بلو اور پھر گڈو نے اچھی طرح اپنے گرد کالے کمبل لپیٹے اور بری طرح ہلنے کی
اداکاری کرتے ہوئے ان کی طرف دوڑنے لگے۔ انہوں نے ہاتھوں کو پھیلا کر ان پر بھی کمبل
ڈالا ہوا تھا۔ دور سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ تین نہیں بلکہ بھیڑیوں کو پورا ریوڑ ان کی طرف

چلا آرہا ہے۔ اور عنقریب ایک ایک کی بوٹیاں کر کے کھا جائے گا۔ باس نے آ
لگائی۔ "بھاگو! بھیڑیئے ادھر ہی آرہے ہیں"۔ آواز سن کر سارے حرددور سر پٹ دوڑنے۔
تو تینوں بے وہیں رک گئے بلکہ واپس ٹیلے کی آڑ میں چھپ گئے۔ جب وہ لوگ جنگل سے
چلے گئے تو پپو، بلو اور گڈو اپنی مہم کو کامیابی سے سر کر کے گھر لوٹ آئے۔

صبح یہ خبر بھی پھیل چکی تھی لیکن کوئی عینی شاہد سامنے نہیں آیا ورنہ وہی چور کہلاتا
پکڑا جاتا۔ یوں تینوں بچوں نے ہر روز، رات کے وقت اسی قسم کی کاروائی کی اور چند ہفتہ
بعد ہی چوروں نے اس جنگل کا رخ کرنا بند کر دیا۔ اس طرف سے سکون ہوا تو ان کے والد
پریشانی دور ہو گئی۔ لیکن دوسرے دن سے انہوں نے سنا کہ ان کے والد اب اس بھیڑیے
تلاش کریں گے جس کا خوف لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گیا ہے چونکہ اس بھیڑیئے سے عوا
جان کو خطرہ لاحق تھا اور ہو سکتا ہے کہ وہ بھیڑیا کل ان کے گھر والوں پر ہی حملہ آور ہو جا
کیا ہوگا۔ اس سے پہلے ہی مسٹر عبدالرحیم اس خطرے کا سدباب کرنا چاہتے تھے اور آ
مصیبت کھڑی ہونے والی تھی۔ بچوں نے باپ کو بہت سمجھایا کہ وہ بھیڑیئے کی تلاش میں
نکلے۔ اس بھیڑیئے کے خوف سے ہی لکڑی چوروں نے جنگل کا پیچھا چھوڑا ہے لیکن ان
ابو نہ مانے اور تیاری کرنے لگے کہ کل رات سے وہ جنگل میں جا کر بھیڑیئے کو تلاش کر
گے۔ جب کسی طرح ان کے ابو باز نہ آئے تو بچوں کو اصل حقیقت اور اصل راز سے پردہ ا
پڑا۔ پپو نے ساری کہانی کہہ سنائی۔ پہلے تو ان کو یقین نہ آیا اور جب یقین آیا تو ابو
صرف انہیں پیار سے ڈانٹا بلکہ شاباش کے ساتھ ساتھ ان کی پاکٹ منی میں بھی اضاف
دیا۔ جب پپو کی خالہ زاد بہن ان کے گھر رہنے آئی تو وہ اس کو ساری باتیں بتا کر اس جگہ
گئے جہاں انہوں نے چوروں کو ڈرایا تھا اور یوں ہنستے ہوئے وہ واپس لوٹے۔

☆☆☆



# دعا کی قبولیت

**کھرام** کا بادشاہ ہر وقت مشکلات کا شکار رہتا تھا۔ کبھی اس کے خلاف
بغاوت کر دیتے تھے اور کبھی سکھ، یہاں تک کہ اچھی بھلی حکومت کے امور سر انجام
ہ دیتے اس کی فوج میں سے جرنیل اس کے خلاف ہو جاتے اور اعلان بغاوت کر
۔ بات یہیں تک محدود نہیں تھی۔ اعلان بغاوت کے ساتھ ساتھ وہ جنگ پر آمادہ
تے بلکہ جنگ کرنے کے لئے لشکروں کے ساتھ روانہ ہو جاتے۔ نہ صرف اسے ان
فالفوں کی مخالفت کا سامنا تھا بلکہ قدرتی آفات بھی اس کی پریشانی کی وجہ بن رہی
۔ اس کے علاقے میں کبھی زلزلہ آجاتا جس سے ہزاروں افراد آناً فاناً موت کا شکار ہو
سینکڑوں گھر تباہ و برباد ہو جاتے۔ راستے مسدود ہو کر ٹریفک کا نظام درہم برہم
تا۔ جس سے نمٹنے کے لئے مہینوں درکار ہوتے تھے۔ ابھی زلزلے کے اثرات ختم نہ
ہ کہ سیلاب آجاتا اور گاؤں کے گاؤں زیر آب جاتے سب فصلیں پکی پکائی ضائع ہو
اور قحط کی وجہ بنتی۔ لوگ بھوکے مرتے اور فاقوں سے تنگ آکر دوسرے علاقوں میں
کر جاتے جس سے آبادی کم ہو جاتی۔ ان میں نہ صرف عام آدمی ہجرت کرتے بلکہ
ت کے محکموں میں کام کرنے والے اچھے عہدے دار بھی رخصت ہو جاتے تھے۔
کے سدباب کا انتظام کیا جاتا تو بارشوں، آندھی اور طوفانوں کا سلسلہ شروع
۔ ان بارشوں، آندھی اور طوفانوں سے وہ کمی بھی پوری ہو جاتی جو سیلابوں اور
سے رہ گئی تھی۔ کئی کئی ماہ انہی تباہ کاریوں سے نمٹنے میں گزر جاتے جو کچھ وقت بچتا
ں سے نبرد آزما رہنے میں صرف ہو جاتا تھا۔

اس کے گھریلو حالات بھی برے تھے۔ بیرونی مداخلتوں سے فارغ ہو کر گھر

آتا تو چار بیٹیوں کی فکر دامن گیر ہوتی کہ وہ جوان ہو چکی ہیں عمر بڑھتی جا رہی ہے لیکن ابھی تک ان کی شادیاں نہیں ہوئی ہیں۔ شادیاں کیسے ہوں کوئی درست ہو تو رشتے آئیں سبھی دشمن بنے ہوئے تھے۔ وجہ یہ کہ بادشاہ کا کوئی بیٹا نہیں تھا جسے اپنی جائیداد کا وارث بناتا۔ یہ صدمہ بھی اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ بادشاہ نے دو شادیاں کیں لیکن دو بیٹیوں کی پیدائش کے بعد پہلی بیوی کا انتقال ہوا تو بادشاہ نے دوسری شادی کر لی۔ اس سے بھی دو بیٹیاں پیدا ہوئیں کوئی بیٹا نہ ہوا۔ ایک دن بادشاہ ان سب باتوں کے بارے میں سوچ سوچ کر آبدیدہ ہو گیا۔ آج رات اسے نیند بھی نہ آئی وہ رات بھر جاگتا رہا۔ تب اسے خیال آیا کیوں نہ شہنشاہوں کے شہنشاہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں عاجزی اور انکساری سے رو رو کر اپنی حالت زار کو بیان کیا جائے۔ وہ ستر ماؤں سے بھی زیادہ اپنے بندے سے پیار کرتا ہے۔ میری حالت پر ضرور کرم فرمائے گا۔ رات کے پچھلے پہر گزر رہے تھے وہ اٹھا اور وضو کر کے مصلے پر بیٹھ گیا اس نے رو رو کر دعائیں مانگیں۔

”اے رب العزت، اے مشکل کشا حاجت روا، میں ہر طرف سے زمینی اور آسمانی آفات و بلیات میں گھرا ہوں مجھے ان سے نجات دے اور کوئی راستہ دکھا جس پر چل کر سکون و آرام پا سکوں اور ان مصیبتوں سے میرا پیچھا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ جائے وہ سر بسجود تھا اور زار و قطار اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ اچانک ایک نور سا جھلملاتا ہوا آیا اور اس پر سایہ فگن ہو گیا وہ سجدے میں پڑا رہا یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ یہ دل کا اجالا تھا اس کے ساتھ ہی اس کی زندگی میں بھی روشنی آ چکی تھی۔ وہ ناشتہ اور ضروری کاموں سے فارغ ہو کر مسند بادشاہت پر جلوہ افروز ہوا تو اس کے ایک وزیر نے آ کر کہا۔ بادشاہ سلامت سپاہیوں نے ایک فقیر کو پکڑا ہوا ہے وہ کہتا ہے کہ بادشاہ سلامت سے مل کر ہی جاؤں گا۔ اسے ہر طرح سمجھایا لیکن وہ آپ سے ملاقات کرنے پر ہی بضد ہے او واپس جانے پر کسی طرح بھی تیار نہیں ہے“۔ بادشاہ سلامت نے صبح سویرے ہی یہ عجیب



بزنی اور سپاہیوں سے کہا۔ ”جاؤ اس فقیر کو ہمارے سامنے پیش کرو“۔ بادشاہ کا حکم سنتے ہی پاہی زندان کی طرف گیا اور اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ وہ اس فقیر کو بادشاہ سلامت کے ربار میں لے آئے جو ملاقات کرنا چاہتا ہے“۔ کمانڈر کا حکم بجا لانا ان کا فرض تھا۔ چونکہ وہ سکری طاقت کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھا۔ کچھ دیر بعد ایک فقیر جو باریش تھا۔ بغیر ستینوں کے کرتا پہنے ہوئے تھا۔ اس نے سر پر لال رنگ کا کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ شکل سے س کی عمر کا اندازہ پچاس برس ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ بادشاہ کے امنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ سلامت نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ”تم کون ہو؟ اور مجھ سے یوں ملنا چاہتے ہو؟“ بادشاہ کی بات سن کر اس نے دربار میں چاروں طرف نظر ڈالی اور موش ہو گیا، بادشاہ زمانہ شناس آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ فقیر سب کے سامنے نہیں بلکہ اس سے ائی میں بات چیت کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس بار بادشاہ سلامت نے اتنے سارے میوں کو باہر بھیجنے کے بجائے خود مسند حکومت سے اٹھا اور فقیر کے ساتھ باہر آنے لگا۔ وزیر نے بڑی عزت و احترام سے بادشاہ سلامت کو چند ساعتوں کے لئے ٹھہرنے کو ا۔ بادشاہ سلامت رکے تو وزیر نے عسکری فوج کے آفیسر کو اشارہ کیا۔ اس نے آ کر فقیر جامع تلاشی لی۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ بادشاہ سلامت اکیلے اس کے ساتھ ہے تھے۔ ایسے موقع سے فائدہ اٹھا کر مدعا کسی ہتھیار سے حملہ کر کے بادشاہ کو جانی مان پہنچا دیتا ہے۔ وزیر نے بادشاہ سلامت کی حفاظت کے لئے یہ اچھا اقدام کیا تھا۔ ے بادشاہ سلامت کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بالکل اسی قسم کی مسکراہٹ فقیر لبوں پر بھی تھی۔ اطمینان کر لینے کے بعد وزیر نے مودبانہ بادشاہ سلامت کو آنکھوں اشارہ کیا۔ اور بادشاہ سلامت فقیر کے ساتھ پائیں باغ میں آ گیا۔ یہاں کی فضا وار اور ماحول پر سکون تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ درختوں پر پرندوں کی چہچہاہٹ بہت لگ رہی تھی۔ دربار میں جس قدر بھی تخلیہ کرا لیا جائے۔ کہتے ہیں دیواروں کے بھی

کان ہوتے ہیں کوئی نہ کوئی اس راز کو جان لیتا ہے جو بادشاہ چھپانا چاہتا ہے اس لئے اس بار بادشاہ سلامت فقیر کو ایسی جگہ لے آیا جہاں کوئی مداخلت کرنے والا یا راز کو سن لینے والا نہیں تھا۔

"ہاں بھئی بولو۔تم مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو؟" بادشاہ سلامت نے بڑی نرمی سے پوچھا۔فقیر نے عقیدت بھری نظروں سے بادشاہ سلامت کے چہرے کی طرف دیکھا اور ایک شعر عرض گزار ہوا۔شعر کچھ یوں تھا۔ہم فقیروں سے دوستی کر لو گر بتا دیں گے بادشاہی کیشعر سن کر بادشاہ سلامت چونک گیا کیونکہ اتنی گہری اور جامع بات کہنے والا کوئی آدمی عام نہیں ہوسکتا۔بادشاہ سلامت نے اس کی بات کی گہرائی تک پہنچتے ہوئے سمجھ لیا کہ وہ کوئی معمولی انسان نہیں ہے اور کم گو ہے۔تھوڑی سی بات میں بڑی بات کہنے کی اہلیت رکھتا ہے اور پھر اس نے اس رات کا ذکر کیا جس رات کو بادشاہ سلامت نے رب العزت سے عاجزانہ درخواست کی تھی کہ اسے مصیبتوں سے نجات دی جائے۔یہ راز افشا ہونے پر بادشاہ سلامت پر کوہ حیرت ٹوٹ پڑا۔وہ بہت حیران اور شاداں ہوا۔اب اس کی سمجھ میں بات آچکی تھی کہ اس کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آگیا ہے اللہ تعالٰی نے اس کی سن لی ہے۔اب جلد ہی اسے زمینی اور آسمانی آفات سے نجات ملنے والی ہے۔لیکن کس طرح؟ یہ بات وہ نہیں جانتا تھا۔بس اس نے فقیر سے دوستی کر لی اور اسے عزت واحترام دے کر دربار میں لے آیا۔

شاہی تاریخ نویس کو بلوا کر کچھ فرمان لکھوایا اور اس بھرے دربار میں با آواز بلند پڑھ کر سنانے کا حکم صادر کیا۔شاہی وزیر نے فرمان سنانا شروع کیا۔"محترم جناب عبدالرحمٰن صاحب! آج سے کہرام کے بادشاہ نیک سیرت کے مشیر خاص ہوں گے۔اس لئے ہر عام اور خاص پر ان کا ادب واحترام اور ان کے حکم کی فرماں برداری لازم ہوگی۔گستاخ اور نافرمان شخص کو شاہی دربار کے قوانین کے مطابق سزائیں دی جائیں گی۔"



اعلان سن کر سپاہی خوف سے تھر تھر کانپنے لگے وہ سوچ رہے تھے کہ ہم نے تو انہیں گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیا تھا اور ان پر سختی بھی کی تھی اب کہیں یہ مشیر خاص ہونے کے بعد ہم پر سختیاں نہ کریں یا ہمیں شاہی ملازمت سے نکال باہر نہ کریں۔لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔بادشاہ سلامت کے مشیر خاص جناب محترم عبدالرحمٰن صاحب نے سب سے رحمدلی کا برتاؤ کیا اور سب سے نرمی سے پیش آئے۔

مشیر خاص محترم عبدالرحمٰن کے دربار میں آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ جب بادشاہ سلامت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔"کیا ہوا بادشاہ سلامت۔آپ اپنی پریشانی کا مجھے رازدار بنالیا کریں اور ہر بات مجھے بتادیا کریں تاکہ اس کا کوئی نہ کوئی حل رب العزت کی مدد سے نکال لیا جائے"۔عبدالرحمٰن کی بات سن کر بادشاہ نے کہا۔"عبدالرحمٰن میرے مخالف بہت زیادہ ہیں آج بھی ہمسایہ صوبے کے راجہ نے میرے خلاف اعلان جنگ کیا ہے وہ ٹھیک ایک ہفتے بعد حملہ آور ہوگا یوں ہزاروں انسانی جانیں ضائع ہو جائیں گی۔یہ لوگ لاشوں پر سیاست کرتے ہیں۔دولت اور ملک و جائیداد حاصل کرنے کے لئے انسانوں کا خون بہاتے ہیں۔بادشاہ کے پاکیزہ خیالات سن کر عبدالرحمٰن نے کہا۔"بادشاہ سلامت مجھے چند دن کی مہلت دیں تو میں اس راجہ کو سمجھا سکتا ہوں اور جنگ سے باز رکھ سکتا ہوں"۔بادشاہ نے اجازت دے دی۔یوں عبدالرحمٰن چند اہلکاروں کے ساتھ کچھ قیمتی تحائف لے کر اس راجہ سے ملنے پہنچ گیا۔وہاں بھی عبدالرحمٰن نے بڑی نرمی سے گفتگو کی اور راجہ کو سمجھایا کہ وہ نو عمر ہے۔نوجوان اور خوبصورت ہے۔عقل مند،ہوشیار اور بادشاہت کرنے کے قابل ہے۔جبھی تو اتنی بڑی ریاست کا راجہ بن کر انتظام سنبھالا ہوا ہے۔عبدالرحمٰن نے اسے سمجھایا کہ وہ جنگ کے بجائے یہی کام پیار ومحبت سے لے سکتا ہے۔"وہ کیسے؟" راجہ نے عبدالرحمٰن سے رازداری سے پوچھا۔"دیکھو برخوردار کہرام کے بادشاہ کی چار جوان خوبصورت بیٹیاں ہیں اور کوئی بیٹا نہیں ہے تم چاہو تو ایک لڑکی کے لئے

ہنا رشتہ بھیج سکتے ہو۔ بادشاہ سلامت کو اس رشتہ پر راضی کرنا میرا کام ہے۔ اس طرح دو
موبے مل کر ایک بڑی ریاست کی صورت اختیار کر جائیں گے۔ اور پھر بادشاہ سلامت
کے کوئی بیٹا بھی نہیں ہے وہ تمہیں داماد سے زیادہ بیٹا تصور کرلے گا اور یوں تم بادشاہ کے
ہت قریب رہو گے"۔ عبدالرحمٰن کی باتیں سن کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس سے پہلے
آج تک اس کو کسی نے اتنا مخلص اور کارآمد مشورہ نہیں دیا تھا۔ وہ جنگ سے باز آیا اور
بدالرحمٰن کے واپس پہنچنے کے دو دن بعد اس کی جانب سے چند عورتیں اور دربار خاص کے
چند مرد قیمتی تحائف باشاہ کہرام کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے اور اپنے آنے کا مدعا
یان کیا بادشاہ سلامت نے تحائف وصول کئے اور شکریہ ادا کیا اور رشتے کا ہاں یا نا میں
واب دینے کے لئے ایک دن کی مہلت مانگی۔ اس دن میں ان تمام مہمانوں کو شاہی
مان بنالیا گیا اور خوب خاطر تواضع کی گئی۔

"عبدالرحمٰن یہ کیسے ممکن ہو گیا کہ بساط ہی پلٹ گئی۔ جو راجہ میرا ہم مذہب اور
دی ہو کر میرے خلاف اعلان جنگ کر چکا تھا وہ میرا رشتہ دار بلکہ داماد بننے پر آمادہ ہو گیا
ہے۔ یہ سب ناممکن سے ممکن کیسے بنا؟" بادشاہ سلامت نے حیرانی سے آنکھوں کو پھیلا کر
چھا۔ "بادشاہ سلامت اللہ رب العزت کی طرف سے مدد اسی طرح آتی ہے اور وہ اپنے
ردوں کو مشکلات سے نجات اسی طرح دیتا ہے۔ کسی کی مدد کرنے کے لئے وہ خود زمین پر
یں آتا بلکہ اپنے نیک بندوں کو ذریعہ اور وسیلہ بنا کر کام آتا ہے۔ بس آپ اس رشتے کو
ں کرلیں اور ہاں کر دیں۔ اس طرح آپ کی ایک بیٹی کی شادی بھی ہو جائے گی اور
پ کو داماد کی صورت میں بیٹا بھی مل جائے گا۔ تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ دو صوبوں کے ملنے
ے ایک بڑی ریاست بن جائے گی جس کی طرف چھوٹے موٹے راجہ میلی آنکھ سے نہیں
یکھ سکیں گے اور یوں آپ کو چند مخالفتوں سے نجات مل جائے گی"۔ عبدالرحمٰن کی باتیں
ے اس کا اور بھی گرویدہ کر رہی تھیں۔ بادشاہ سلامت نے مہمانوں کو ہاں میں جواب دیا۔



اور ڈھیر سارے تحفے دے کر عزت سے شاہی انداز میں روانہ کیا۔ یوں چند ہفتوں بعد
راجہ کی شادی کہرام کے بادشاہ کی بڑی شہزادی سے ہو گئی۔

"بادشاہ سلامت ایک عرض اور تھی"۔ عبدالرحمٰن نے موقع پا کر بادشاہ سلامت
سے بات کی۔ "ہاں عبدالرحمٰن بلا جھجک بیان کرو"۔

"بادشاہ سلامت شادی کی تقریب میں تمام اسلامی اصولوں کو مدنظر رکھا جائے
اور کھانے میں غریبوں، فقیروں، یتیموں، مساکین اور بیواؤں کے ساتھ ساتھ مفلس و
ناداروں کا بھی خیال رکھا جائے۔ اس سے انسان آسمانی آفات سے محفوظ رہتا ہے"۔
عبدالرحمٰن کی بات سن کر بادشاہ سمجھ گیا کہ جو لوگ اپنی شادیوں کی تقریبات میں فضول پیسہ
ضائع کرتے ہیں اور حرام کاری کی رسوم کی ادائیگی میں مصروف رہتے ہیں تو بعد میں ان
غلط رسوم کی نحوست اس کے سامنے بیٹی کا گھر اجڑ کر طلاق کی صورت میں سامنے آتی ہے۔
عبدالرحمٰن کی خواہش اور مشورے کے مطابق بادشاہ نے صوبے بھر میں اعلان کر دیا کہ آج
اس کی بیٹی کی شادی کی خوشی میں دعوت عام ہے ہر شخص آئے اور پیٹ بھر کر کھانا کھائے۔
ناداروں، یتیموں اور غریبوں کے لئے خیرات وصدقے کا بھی انتظام ہے اور یہی ہوا لوگ
آئے شکم سیر ہو کر کھایا اور بادشاہ کے حق میں دعائیں کیں کہ رب العزت انہیں انسان کے
شر اور پڑوسیوں کی ایذا رسانیوں سے بچائے۔ بادشاہ سلامت نے محسوس کیا کہ واقعی اللہ
تعالیٰ نے صدقہ وخیرات کرنے کے صدقے میں اسے اس سال سیلاب جیسی آفت سے
محفوظ رکھا ہے۔ ورنہ ہر سال کہرام میں سیلاب کسی آفت کے طور پر نازل ہوتا اور سب کچھ
تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا۔

حاسدین اور دشمنوں کو بادشاہ کہرام کی یہ خوشیاں راس نہ آئیں وہ جل بھن کر
راکھ ہو گئے دو ریاستوں نے جو بائیں بازو کی پڑوسی تھیں سر جوڑ لیا اور مل کر بادشاہ کہرام پر
حملہ آور ہونے کے منصوبے بنائے جانے لگے۔ یہ خبر ایک یتیم بچے نے بادشاہ کہرام تک

پہنچائی۔ یہ یتیم بچہ اسی خاندان سے تعلق رکھتا جس خاندان میں بادشاہ کہرام سے جنگی طریقوں پر نمٹنے کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ بادشاہ نے اس بچے کو مالا مال کردیا لیکن پوچھا کہ اس نے اس کے ساتھ یہ رحم دلی کیوں دکھائی ہے۔ بچے نے کہا کہ دو دن سے بھوکا تھا کہ آپ کی سخاوت نے مجھے سیر ہونے کا موقع دیا میں نے آپ کا نمک کھایا تھا۔ جس کی نمک حلالی کا میں نے ثبوت دیا ہے۔

بادشاہ سلامت اور عبدالرحمٰن نے دونوں مخالف راجاؤں کو سمجھانے اور جنگ سے باز رکھنے کی بڑی کوشش کیں لیکن بے سود رہیں۔ وہ کسی طور پر جنگ سے باز آنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ جب ساری تدابیر ناکام ہوگئیں تو عبدالرحمٰن نے جنگی تیاریوں کا حکم دے دیا۔ یوں دونوں مخالف راجاؤں کی افواج اور ادھر بھی کہرام کے بادشاہ اور اس کے داماد کی ریاست کی فوجیں آمنے سامنے آگئیں۔ دراصل یہ مخالف مذہبی بنیاد پر تھی۔ کیونکہ دونوں مخالف راجہ ہندو تھے اس لئے وہ مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہوئے لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ ان کی فوج کا سالار اعظم اور بڑے بڑے فوجی مسلمان تھے۔ جنگ شروع ہونے کے لئے تیاریاں ہورہی تھیں کہ عبدالرحمٰن کو موقع مل گیا اس نے مخالف فوج کے سالار اعظمکو بے ہتھیار کے بات چیت کرنے کو کہا اور کہلا بھیجا کہ اس بات چیت میں تیرا دین و دنیا کا فائدہ ہے یہ بات اس سالار اعظم کے دل پر اثر انداز ہوگئی اور وہ اپنی فوج سے بہانہ کرکے عبدالرحمٰن سے ملنے کے لیے آگیا۔ عبدالرحمٰن نے اسے سمجھایا کہ وہ مسلمان ہے اور اپنے ہندو آقاؤں کے اشارے پر مسلمانوں کا ناحق خون بہانے پر تلا ہے اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوجائے گا اور تیرا مغیوب ہونا لازمی ہوگا جب کہ اگر وہ باز آکر جنگ روک دیتا ہے اور اپنا ارادہ جنگ ملتوی کردیتا ہے تو نہ صرف اسے بادشاہ کی دامادی حاصل ہوگی بلکہ اللہ رب العزت کی رضا و خوشنودی بھی پائے گا کیونکہ ایک مسلمان کا قتل ساری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ یہ باتیں بتا کر سالار اعظم کو ساری تفصیل بتائی اور



مزید باتیں سمجھائیں۔ سالار اعظم کے ذہن میں اسلام کا جذبہ کارفرما نظر آنے لگا۔ اس نے عبدالرحمٰن سے ایک وعدہ لیا اور واپس جاکر چند بڑے بڑے مسلمان سالاروں کو بغاوت پر راضی کیا اور یوں جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ میدان جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ سالار اعظم نے اور اس کے باغی ساتھیوں نے کہرام کے بادشاہ کی فوجوں کے ساتھ مل کر زوردار حملہ کیا۔ لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ قتل و غارت گری نہ ہو۔ یوں ان کی فوج میدان چھوڑ کر فرار ہوگئی لیکن سالار اعظم نے دونوں ریاستوں پر اپنے اتحادی اور باغی ساتھیوں کی مدد سے قبضہ کرلیا۔ بادشاہ کہرام نے سالار اعظم کو صوبے دار مقرر کیا اور وہ دونوں ریاستیں اس کے حوالے کردیں۔ سالار اعظم نے عبدالرحمٰن سے وعدہ وفا کرنے کو کہا تو عبدالرحمٰن نے ہاں کہہ دیا یوں سالار اعظم کا رشتہ بادشاہ سلامت کی دوسری لڑکی سے ہو گیا۔ وہ بادشاہ جو کبھی آفات و بلیات اور فکرمندی میں ہر وقت گھرا رہتا تھا۔ اب خوش و خرم اور پرسکون زندگی بسر کررہا تھا۔ نہ صرف وہ دماغی طور پر پرسکون ہوگیا تھا بلکہ دو بچیوں کی شادیاں کرکے فرائض سے بھی سبکدوش ہوگیا تھا۔ ان تمام باتوں اور مہربانیوں پر وہ رات کے اندھیرے میں خدائے یکتا کا شکر بجالاتا اور دن کو عبدالرحمٰن کا شکر ادا کرتا۔

اس سال زلزلہ تو آیا لیکن زیادہ تباہی نہ پھیلا سکا کیونکہ زلزلے کی شدت ہلکی تھی۔ عبدالرحمٰن نے فوراً زلزلے کا نوٹس لیا اور تباہی کے اثرات کو دور کرنے کے لئے ہر ممکن اقدامات کیے اور تباہی سے متاثر ہونے والوں کی دل کھول کر مدد کی۔ عبدالرحمٰن جب اس زلزلے سے نمٹ کر مہم سے واپس آرہا تھا تب اسے کسی نے بتایا کہ مشرق کی جانب واقع دو صوبوں کے راجہ بہت ظالم ہیں اور اپنی رعایا پر بڑا ظلم و ستم کرتے ہیں۔ معصوم بچوں کو روند ڈالتے ہیں۔ عورتوں کا سہاگ اجاڑ دیتے ہیں اور مردوں کو کھیل کھیل میں قتل کردیتے ہیں۔ جوان لڑکیوں کو اغوا کرلیتے ہیں، ان مظلوموں کے دل سے بددعائیں نکلتی ہیں۔ عبدالرحمٰن نے یہ باتیں سنیں تو اس کا دل بھر آیا۔ وہ سمجھ گیا انسان کے

دکھی دل کی بددعاؤں سے اور دل آزاریوں سے بھی قدرتی آفات آسمان سے نازل ہوتی ہیں۔اس لئے اس نے اپنی چاروں ریاستوں کے راجاؤں اور سالار اعظموں کو خطوط لکھے کہ وہ مشرق میں واقع صوبوں کے راجاؤں کو ظلم وستم سے باز رکھنے کے لئے اپنا اثر ورسوخ استعمال کریں کیونکہ کسی بھی مظلوم شخص کو جو اس کی رعایا میں سے ظلم وستم سے بچانا اور اس کی عزت وآبرو، مال وزر اور سیرتو کردار بلکہ رزق وروزگار کی حفاظت کرنا حکومت کا کام ہے۔اس لئے تمام راجاؤں نے حکومت کہرام کی جانب سے انہیں ظلم وستم سے باز رکھنے کی کوشش کی وہ اپنی ضد پر اڑے رہے تو ان کے خلاف جنگی اقدامات کرنے پڑے۔ چنانچہ جنگ ہوئی تو باہر کی جانب سے کہرامی فوج کے سپاہیوں نے انہیں گھیر لیا اور ملک کے اندر عوام نے ان کا جینا دوبھر کر دیا۔ یہاں تک کہ بہت جلد افواج اور عوام کی ملی بھگت سے وہ ریاستیں بھی قبضے میں آگئیں اور یوں بادشاہ کہرام نے ان ریاستوں کا دورہ کیا اور عوام کے حالات سے آگاہ ہوا۔اس نے ایک دن کھلی عدالت لگائی اور عوام سے مشورہ کیا کہ ان ریاستوں کی بادشاہت کا حقدار کون ہونا چاہیے یا وہ کس کو بادشاہت کے قابل سمجھتے ہیں جو، ان پر ظلم نہ کرے بلکہ ان کے ساتھ مشفقانہ رویہ اختیار کرے۔

بادشاہ سلامت کی رحمدلی دیکھ کر ایک بوڑھا اٹھا اور اس نے عرض کی۔بادشاہ سلامت دو نوجوان بھائیوں کو ان ظالم راجاؤں نے نظر بند کر رکھا ہے۔ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ ان ظالموں کے خلاف آواز بلند کرتے تھے اور انہیں ظلم وستم سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔جس کی پاداش میں ان ظالم راجاؤں نے انہیں قید کر کے زندان میں ڈال دیا ہے اور حبس بے جا میں رکھا ہے۔وہ نوجوان نہ صرف بادشاہت کرنے کے اہل ہیں بلکہ قابلیت رکھتے ہیں کہ ان دونوں ریاستوں کی تقدیر کو بدل دیں گے۔ان کی قابلیت سے یہ دونوں راجہ خوفزدہ تھے۔تیسری بات یہ تھی کہ یہ ظالم راجہ سکھ ہیں اور انہوں نے نے ان دونوں بھائیوں کو مسلمان ہونے کے ناطے قید کر دیا ہے۔بادشاہ سلامت میری رائے



میں ان دونوں بھائیوں کو ایک ایک ریاست عطا کر دی جائے۔ان کو ان کی محنت کا صلہ بھی مل جائے گا اور قید زندان سے بھی آزادی۔مجھے امید ہے وہ مشفقانہ رویہ اختیار کریں گے اور رواداری کا سلوک بھی"۔بڑے میاں کی باتیں سن کر بادشاہ سلامت کو بھی اشتیاق ہوا کہ ایسے نوجوانوں کو دیکھا جائے اور ان کو راج پاٹ کے لئے پرکھا جائے۔پہلے بادشاہ سلامت نے عوام کی طرف دیکھا اور رائے لی کہ وہ کیا کہتے ہیں۔کیا واقعی ان کے دل میں بھی ان دو بھائیوں کے لئے ایسے ہی خیالات اور نیک جذبات ہیں۔سب نے بڑے میاں کی تائید کی اور اپنی رائے کا اظہار کیا واقعی جمال احمد اور کمال احمد کو ان کی ریاستوں کا راجہ ہونا چاہیے اس لئے بادشاہ نے حکم دیا کہ جمال احمد اور کمال احمد کو اس کے سامنے پیش کیا جائے۔جمال احمد اور کمال احمد کو بادشاہ کے سامنے لایا گیا تو بادشاہ انہیں دیکھ کر بہت متاثر ہوا کہ ان کی پیشانیوں پر نماز کے نشانات تھے ان کے چہروں سے نور چمک رہا تھا۔ وہ بادشاہ کو دیکھتے ہی فرماں برداری کے لئے ان کے قدموں میں گرے اور فرمانبرداری قبول کرتے ہوئے ہر قسم کی احسان مندی کا شکریہ ادا کیا۔وہ چہرے سے واقعی بہت ذہین، عقلمند، پڑھے لکھے اور بہادر نظر آرہے تھے۔بڑے میاں نے سچ کہا تھا کہ ان دونوں بھائیوں میں حکومت کے امور چلانے کی قابلیت واہلیت موجود ہے۔

بادشاہ سلامت نے دونوں ریاستوں کی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور ایک ریاست کا راجہ جمال احمد کو اور دوسری ریاست کا راجہ کمال احمد کو مقرر کر دیا۔ابھی ان ریاستوں کا مزید نظام اور دیگر انتظامات کو درست کرنے کے لئے بادشاہ سلامت قیام کئے ہوئے تھے کہ عبدالرحمٰن نے ایک میٹنگ جمال احمد اور کمال احمد سے اکیلے میں کی اور انہیں اپنے مفید اور سودمند مشوروں سے نوازا۔" جمال احمد اور کمال احمد کو عبدالرحمٰن کی باتیں دل میں گھر کرتی محسوس ہوئی۔شام کو بادشاہ سلامت مسند حکومت پر جلوہ افروز ہوئے تو عبداللہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔" بادشاہ سلامت کوئی ایسی کمزوری جو جمال احمد میں ہو۔آپ

کو نظر آئی ہے''۔ عبدالرحمٰن کا اچانک سوال سن کر بادشاہ سلامت تذبذب کا شکار ہو گئے۔'' نہیں عبدالرحمٰن ایسی تو کوئی بات نہیں ہے جو جمال احمد کی کمزوری کہلا سکے''۔ بادشاہ نے سوچ کر کہا۔'' تو کیا بادشاہ سلامت کمال احمد میں کوئی برائی ہے جو بدنامی اور رسوائی کا سبب بنے''۔ بادشاہ سلامت یکے بعد دیگرے سوال پر بوکھلا گئے۔'' نہیں کمال احمد میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ہے جو برائی مقصود کی جا سکے۔

'' تو پھر عزت مآب ہمیں آپ اپنا بیٹا بنا لیجئے''۔ اس بار عبدالرحمٰن کا اشارہ پا کر جمال احمد اور کمال احمد نے جرأت سے کام لیا اور شاہ کبرام کے قدم چھو لئے۔ بادشاہ سلامت نے عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا۔ عبدالرحمٰن مسکرا دیا لیکن اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری تھے۔ بادشاہ سلامت نے اس سے رونے کی وجہ پوچھی تو عبدالرحمٰن کہنے لگا۔

'' بادشاہ سلامت آج اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر اس دعا کو قبولیت کا درجہ عطا کیا ہے جو آپ نے اس پروردگار عالم سے راز و نیاز کے وقت میں مانگی تھیں۔ آپ کی گھریلو مشکل چاروں بیٹیوں کی شادی ہو کر چلی گئی ہے۔ آپ کے مسلسل صدقہ خیرات کرنے سے سیلاب، زلزلے اور بارش و طوفان آنے بند ہو گئے ہیں۔ آپ کے مخالفین آپ کے دست بلکہ رشتے دار بن گئے ہیں آپ کی چھوٹی سی ریاست پورے ملک پر محیط ہو گئی ہے۔ اب آپ کی طرف کوئی دوسری حکومت بھی میلی نظر نہ ڈال سکے گی۔ آپ سب اتحاد و اتفاق اور خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر رکھے گا۔ میرا کام ختم ہو گیا ہے میں آپ سے اجازت چاہوں گا کیونکہ آپ نے مجھ سے دوستی کر لی تھی اور میں نے اپنے قول کے مطابق آپ کو بادشاہی کے گر بتا دیئے ہیں۔